مواعظ حکیم الامت اور دینی رسائل کی اشاعت کا امین

ماہنامہ
الامداد
لاہور پاکستان

مدیر مسئول
(مولانا) ڈاکٹر احمد میاں تھانوی

مدیر
ڈاکٹر خلیل احمد تھانوی

جلد ۲۱ | جمادی الاولیٰ ۱۴۴۱ھ | جنوری ۲۰۲۰ء | شمارہ ۱

تفصیل الدین
اجزائے دین کی تفصیل

از افادات

حکیم الامت مجدد الملۃ حضرت مولانا محمد اشرف علی تھانوی قدس سرہٗ

عنوانات و حواشی: ڈاکٹر مولانا خلیل احمد تھانوی

قیمت فی پرچہ =/۴۰ روپے زرسالانہ =/۴۰۰ روپے

ماہنامہ الامداد لاہور
35422213
35433049
پتہ دفتر جامعہ دارالعلوم الاسلامیہ رجسٹرڈ
۲۹۱۔ کامران بلاک علامہ اقبال ٹاؤن لاہور

ناشر: (مولانا) ڈاکٹر احمد میاں تھانوی
مطبع: ہاشم اینڈ حماد پریس
۱۳/۲۰ اریٹی گن روڈ بلال گنج لاہور
مقام اشاعت
جامعہ دارالعلوم الاسلامیہ رجسٹرڈ لاہور پاکستان

وعظ

تفصیل الدین
(اجزائے دین کی تفصیل)

جس طرح ہر قوت محدود ہے اسی طرح انسان کی عقل بھی محدود ہے۔ عقل سے اس وقت تک کام لو جب تک وہ کام دے سکے اور جہاں اس کا کام نہیں وہاں اس کو چھوڑ دو اور حکم کا اتباع کرو۔ شریعت کے معاملہ میں اصول تک تو عقل کام دیتی ہے اور فروع میں یہ تنہا بیکار ہے آگے وحی سے کام لو ورنہ یاد رکھو عمر بھر رستہ نہ ملے گا کیونکہ سمعیات میں عقل کا کام نہیں وہاں تو اتباع رسول کی ضرورت ہے۔

ایمان وعمل کے متعلق یہ وعظ ۲۳ محرم ۱۳۳۱ھ کو جامع مسجد غازی پور میں اہل شہر کی درخواست پر ہوا۔ ۲ گھنٹے ۴۰ منٹ میں ختم ہوا اور مولانا سعید احمد صاحب تھانوی نے قلمبند کیا اور مولانا ظفر احمد صاحب نے تسوید و تفصیل کی۔

خلیل احمد تھانوی

وعظ: تفصیل الدین (اجزائے دین کی تفصیل)

نمبر شمار	عنوانات	صفحہ
۱	تمہید	۷
۲	درجہ تفریع وتجدید	۸
۳	درجہ توضیح وتفصیل	۹
۴	دین کی بے قدری	۱۱
۵	دعا اور وظیفہ کا فرق	۱۳
۶	دعا کا طریق	۱۶
۷	شیطانی اغوا	۱۹
۸	استقلال کی ضرورت	۲۱
۹	مقام دعا	۲۲
۱۰	تبرکات کا مسئلہ	۲۵
۱۱	حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شفقت	۲۶
۱۲	بغیر ایمان بخشش نہیں	۲۷
۱۳	نسبت کا اثر	۲۸
۱۴	نفع تبرکات کی صورت	۲۹
۱۵	شرف نسب کی حیثیت	۳۱
۱۶	حضرت تھانوی کا حکیمانہ جواب	۳۲
۱۷	''السلام علیکم'' کہنا مسنون ہے	۳۲
۱۸	حضرت تھانویؒ کا جواب لاجواب	۳۳
۱۹	انتساب کے بارے میں قول فیصل	۳۴
۲۰	ایمان وعمل صالح کا اہتمام	۳۵
۲۱	عقائد کی غلطیاں	۳۶
۲۲	خرابی کی وجہ	۳۷
۲۳	کتب بینی میں احتیاط	۳۸

۲۴.....	خودرائی کا مرض.....	۳۹
۲۵.....	ہماری عقل کا حال.....	۴۰
۲۶.....	خلاف عادت اور خلاف عقل کا فرق.....	۴۱
۲۷.....	محال عقلی پر غلط استدلال.....	۴۲
۲۸.....	ثبوت کی حقیقت.....	۴۳
۲۹.....	پل صراط کی حقیقت.....	۴۵
۳۰.....	طریق شریعت.....	۴۹
۳۱.....	عقل کی حد.....	۵۰
۳۲.....	تقلید کی ضرورت.....	۵۲
۳۳.....	نتیجہ افراط وتفریط.....	۵۴
۳۴.....	روح شریعت.....	۵۴
۳۵.....	انکشاف اسرار وحقائق.....	۵۶
۳۶.....	عقل کا معارضہ.....	۵۸
۳۷.....	اعتقاد رسالت کی ضرورت.....	۶۰
۳۸.....	اجزاء دین کی اہمیت.....	۶۱
۳۹.....	اجزائے دین کی تفصیل.....	۶۳
۴۰.....	بری صحبت کا اثر.....	۶۵
۴۱.....	ہماری کوتاہیاں.....	۶۶
۴۲.....	جائز وناجائز کی بحث.....	۶۸
۴۳.....	اسلامی تہذیب.....	۶۹
۴۴.....	جدید معاشرت.....	۷۱
۴۵.....	مسئلہ استیذان.....	۷۳
۴۶.....	تصوف کی حقیقت.....	۷۵
۴۷.....	اسلام کی حقیقت.....	۷۶
۴۸.....	اقسام اعمال.....	۷۷
۴۹.....	اخبار الجامعہ.....	۸۱

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

خطبۂ ماثورہ

الحمد للہ نحمدہٗ و نستعینہٗ ونستغفرہٗ و نؤمن بہ ونتوکل علیہ ونعوذ باللہ من شرور انفسنا ومن سیئات اعمالنا من یھدہ اللہ فلا مضل لہ ومن یضللہ فلا ھادی لہ ونشھد ان لا الہ الا اللہ وحدہ لا شریك لہ ونشھد انّ سیدنا ومولانا محمدًا عبدہ ورسولہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وعلیٰ اٰلہ واصحابہ وبارك وسلم اما بعد:

فاعوذ باللہ من الشیطن الرجیم

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

(إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ سَيَجْعَلُ لَهُمُ الرَّحْمٰنُ وُدًّا)(۱)

تمہید

صاحبو! یہ وہی آیت ہے جس کے متعلق کل ایک ضروری بیان کیا گیا تھا۔ چونکہ وہ دو اجزاء سے مرکب تھا اور کل ایک ہی جزو کا تفصیلاً ذکر ہوا تھا اور دوسرا جزو تفصیل سے رہ گیا تھا۔ گو مجملاً اسکا ذکر بھی ہو چکا تھا اور وہ اجمال گوشافی(۱) نہ تھا مگر کافی ضرور تھا، حتی کہ اگر آج کا بیان نہ بھی ہوتب بھی کچھ ضرر نہ تھا(۲)۔ کیونکہ ایک جزو کی تو تفصیل بھی ہو چکی تھی اور دوسرے جزو کے متعلق ایک قاعدہ کلیہ بیان کر دیا گیا تھا جس کے پیش نظر رکھنے کے بعد تفصیل کا نہ ہونا مضر(۳) نہ تھا مگر جب تفصیل کا موقع مل گیا تو میں نے چاہا کہ اس کی بھی کسی قدر تفصیل کر دی جائے۔

کسی قدر کی قید اس لیے بڑھادی کہ تفصیل علی قدر اتم(۴) کے لیے ایک جلسہ کافی نہیں ہوسکتا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ۲۳ برس تک اس کی تفصیل فرمائی پھر بھی اس کے لیے توضیح کی ضرورت ہوئی۔ اور اس کے لیے حق تعالیٰ نے حضور کے بعد ہر زمانہ میں

(۱) ”بلاشبہ جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے اچھے کام کئے۔ اللہ تعالیٰ ان کے لیے محبت پیدا کر دیگا“ سورہ مریم:۹۶ (۱) اس اجمالی بیان سے سامعین کی اگرچہ تشفی نہیں ہوئی ہوگی (۲) نقصان (۳) نقصان دہ (۴) مکمل تفصیل بیان کرنے کے لیے۔

حاملان دین کو پیدا فرمایا جو برابر اس کی توضیح (۱) کرتے رہے۔ حتی کہ خیر القرون (۲) کے ختم تک (یعنی قرن ثالث (۳) پر جو تبع تابعین کا زمانہ ہے اور جملہ آئمہ مجتہدین اسی زمانہ میں ہوئے ہیں) وہ توضیح بھی علی وجہ الکمال (۴) ہوگئی (تو جس مضمون کی تفصیل اتنے عرصہ دراز میں ہوئی ہو اس کو علی قدر اتم (۵) ایک جلسہ میں کیونکر بیان کیا جاسکتا ہے۔ اب سمجھئے کہ اس مضمون کی تفصیل وتوضیح تو خیر القرون کے ختم تک پوری ہوگئی)

درجہ تفریع وتجدید

لیکن اب دو مرتبے باقی رہ گئے۔ ایک تفریع کہ قیامت تک انہی اصول پر حوادث جزئیہ کے احکام کی تفریع (۶) کرتے رہنا۔ یہ کام علم وفہم کا ہے۔ اگرچہ حق تعالیٰ نے اجتہاد مطلق کو ختم کردیا ہے۔ نہ اس وجہ سے کہ خداوند کریم کی رحمت (معاذ اللہ) ختم ہوگئی بلکہ اس لیے کہ خداوند تعالیٰ کا قاعدہ اور ان کی عادت مستمرہ (۷) یہ ہے کہ جب کسی چیز کی ضرورت نہیں رہتی اس وقت اس کو ختم کردیتے ہیں۔ اس عادت کے موافق چونکہ حضرات مجتہدین کے بعد اجتہاد کی ضرورت نہ رہی تھی۔ اس لیے اس کو ختم کردیا البتہ تفریع کی ضرورت قیامت تک رہے گی۔ اس لیے اتنا اجتہاد اور اتنا فہم قیامت تک کے لیے باقی ہے جس سے مجتہدین کے اصول پر علماء جزئیات کو متفرع کرتے رہیں (۸)۔ چنانچہ ہر زمانہ میں ایسے لوگ پیدا ہوتے ہیں جو نئے نئے جزئیات میں حکم شرعی بتلاتے رہتے ہیں اور مجتہدین کے اصول ہی پر جزئیات حادثہ کو متفرع کرتے رہتے ہیں (۹)۔

دوسرے اس کی ضرورت بھی باقی ہے کہ ہر زمانہ میں حق کو باطل سے ممتاز کردیا جائے کیونکہ زمانہ نبوت سے بعد (۱۰) ہوجانے کی وجہ سے بعض دفعہ حق وباطل مخلط ہوجاتا ہے (۱۱) خواہ عوام کی بے تمیزی سے یا اہل غرض علماء کی وجہ سے۔ تو ایسے وقت میں حق تعالیٰ کسی ایسے مقبول بندے کو پیدا فرماتے ہیں جو حق کو باطل سے ممتاز

(۱) وضاحت کرتے آرہے ہیں (۲) بہترین زمانے کے اختتام تک (۳) تیسری صدی (۴) مسائل دینیہ کی وضاحت بھی مکمل طور پر ہوگئی (۵) مکمل درجہ میں (۶) جزئی مسائل نکالتے رہنا (۷) مستقل عادت (۸) مجتہدین نے مسائل مستنبط کرنے کے جو اصول مقرر کردئے ہیں ان کے ذریعہ جزئی مسائل قیامت تک نکالتے رہیں گے (۹) جدید پیش آنے والے مسائل کا حال نکالتے ہیں (۱۰) دوری کے سبب (۱۱) حق وباطل باہم مل جاتے ہیں

کر کے صراط مستقیم کو واضح کر دیتا ہے۔ یہ درجہ تجدید ہے۔ اس کے متعلق حدیث میں پیشین گوئی ہے۔ ان اللّٰہ یبعث فی امتی علی راس کل مائۃ من یجدد لھا دینھا (۱) کہ حق تعالیٰ میری امت میں ہر سو برس کے بعد ایک ایسے شخص کو مبعوث فرماتے ہیں جو دین کی تجدید کر دیتا ہے (۲)۔

یعنی حق کو باطل سے ممتاز کر دیتا ہے۔ چنانچہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد ہر صدی پر کوئی نہ کوئی مجدد ضرور ہوا ہے۔ تو یہ دو درجے اب بھی باقی ہیں اور قیامت تک رہیں گے۔ ایک تفریع ایک تجدید (۳) اور یہ دونوں خدمتیں الگ الگ ہیں اور اگر کوئی اللہ کا بندہ دونوں کا جامع (قلت ومن الجامعین لھما سیدی حکیم الامت مجدد الملت ادام اللّٰہ فیضوضھم وبرکاتھم سالت العارف باللہ سیدی مولانا محمد یحییٰ رحمۃ اللّٰہ علیہ الخادم الخاص سیدی قطب زمانہ الشیخ مولانا رشید احمد گنگوھی قدس سرہٗ عن مجدد ھذہ السنۃ الحاضرۃ فقال کنت اظن اولاً انہ شیخی مولانا رشید احمد قدس سرہ ثم رایتہٗ قد انتقل الی ربہ علی رأس المائۃ والان مجدد ھذہ الملۃ عندی خالك مولانا اشرف علی ادام اللّٰہ فیوضہٗ قلت وقداذعن بھذا) (۴) ہو تو یہ خدا تعالیٰ کی رحمت ہے۔

درجہ توضیح وتفصیل

تو اب توضیح وتفصیل (۵) کا درجہ ہے اس کا ابہام (۶) کے ساتھ بیان ہو سکتا ہے مگر یہ بیکار ہے کیونکہ جس تفصیل کو کوئی نہ سمجھے وہ فضول ہے اور پوری طرح بیان کیا جائے تو بتلایئے اس کے لیے ایک جلسہ کیسے کافی ہو سکتا ہے۔ اس لیے میں نے کسی قدر

(۱) کنز العمال: ۳۴۸۲۳، مشکوۃ المصابیح: ۲۴۷ (۲) اس کو مجدد کہتے ہیں جیسے خود حضرت تھانویؒ تھے (۳) ایک فروعی مسائل کا استنباط دوسرے تجدید دین (۴) میں کہتا ہوں کہ ان دونوں صفات کے جامع میرے آقا حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ مدفیوضہم ہیں میں نے قطب زمانہ سیدی مولانا رشید احمد گنگوہی کے خادم خاص مولانا محمد یحییٰ رحمہ اللہ سے پوچھا کہ اس صدی کا مجدد کون ہے انہوں نے جواب دیا کہ میرا پہلے گمان تھا کہ وہ مولانا رشید احمد گنگوہیؒ ہیں پھر میں نے دیکھا کہ صدی کے آخر میں اللہ نے اس کو تمہارے ماموں مولانا محمد اشرف علی تھانوی مدفیوضہ کی طرف منتقل کر دیا اب میری پختہ رائے یہی ہے کہ وہ اس صدی کے مجدد ہیں (۵) تو اب صرف وضاحت کرنے کا درجہ باقی ہے (۶) مبہم انداز میں۔

کی قید لگائی یعنی یہ تفصیل اضافی ہوگی جو تفصیل اتم کے مقابلہ میں تو اجمال ہے اور اجمال سابق کے مقابلہ میں تفصیل ہے(۱) تو یہ درجہ تفصیل اضافی کا باقی رہ گیا تھا اس کو میں آج بیان کرنا چاہتا ہوں اور اِسی لیے اُسی آیت کو اختیار کیا گیا جس کو کل بیان کیا گیا تھا باقی یہ جو میں نے کہا ہے کہ کل جزو ثانی کو بھی اجمالاً بیان کر چکا ہوں تو شاید کسی کے ذہن میں وہ اجمال نہ رہا ہو۔ اس لیے میں اس کو بھی یاد دلاتا ہوں کہ میں نے اخیر مضمون میں کہا تھا کہ حق تعالیٰ نے ود (اور محبوبیت) کا مدار ایمان اور عمل صالح پر رکھا ہے۔ اس کے متعلق میں نے کہا تھا کہ اس کا طریقہ علوم دین ہیں جو دو طرح سے حاصل ہو سکتے ہیں یا تعلیم و تعلم سے یا علماء کی مخالطت (۲) اور ان کے اقوال و مواعظ سننے سے۔ پس کل گو اس مضمون کی تفصیل نہ کی گئی مگر وہ طریقہ بتلا دیا گیا تھا جس سے عمر بھر تفصیل ہو سکتی تھی۔ تو وہ بیان بھی مکمل تھا۔

اس میں ابہام نہ تھا کیونکہ ابہام کی صورت یہ ہوتی ہے کہ کلام مفہم مراد نہ ہو(۳) اور یہ اجمالی بیان غیر مفہم (۴) نہ تھا بلکہ کافی تھا۔ اگر آج کا بیان نہ ہوتا تب بھی کوئی جزو سمجھنے سے باقی نہ رہا تھا البتہ ایک جزو کی تفصیل پہلے جزو کے برابر نہ ہوئی تھی تو اس کے بیان کے لیے خدا تعالیٰ نے اس وقت موقع دے دیا ہے، تو اس وقت میں اس کی بھی تفصیل کرنا چاہتا ہوں۔ یہ حاصل ہے آج کے بیان کا، توضیح اس کی یہ ہے کہ ہر مقصود میں دو چیزیں ہوتی ہیں ایک نفس مقصود اور ایک اس کا ذریعہ۔

اب سمجھو کہ حق تعالیٰ نے اس آیت میں ایمان و عمل صالح پر ود(۵) کا مدار رکھا ہے۔ اس میں بھی دو چیزیں ہیں۔ ایک مقصود جس کا بیان ۔سَيَجْعَلُ لَهُمُ الرَّحْمٰنُ وُدًّا (اللہ تعالیٰ ان کے لیے محبت پیدا کر دے گا) میں ہے اور ایک طریق یعنی ایمان عمل صالح جس کا بیان اَلَّذِيْنَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ (بلاشبہ جو لوگ ایمان لائے اور نیک عمل کئے) میں ہے تو کل کے بیان کا حاصل مقصود کی تفصیل تھی اور آج طرق کی تفصیل ہے اور مقصود بہت مختصر ہے اور اس کی تفصیل بھی کچھ طویل نہیں ہے یعنی محبوبیت

(۱) مکمل تفصیل کے مقابلے میں اجمال اور سابقہ اجمال کے مقابلے میں تفصیل ہوگی گویا من وجہ اجمال من وجہ تفصیل (۲) علماء کے ساتھ میل جول سے (۳) بات سمجھ میں نہ آئے (۴) ناقابل فہم (۵) محبت

اس کی بہت سی اقسام بیان کرنے کی حاجت نہیں۔ پس یہ سمجھ لینا کافی ہے کہ ہم حق تعالیٰ کے محبوب بن جاویں گے اور اس کے فروع میں سے یہ بھی بتلا دیا گیا کہ یہ شخص خلق (۱) کا بھی محبوب ہوجاوے گا تو یہ مضمون زیادہ تفصیل کا محتاج نہ تھا مگر اس کی تفصیل اس لیے بیان کی گئی تھی کہ آج کل لوگ ثمرات آخرت کو بہت ہی بے وقعت سمجھتے ہیں۔

دین کی بے قدری

بس ان کے نزدیک بڑا ثمرہ ہے (۲) کہ کچھ روپیہ مل جائے چنانچہ ایک عہدہ دار کی بیوی نماز پڑھتی تھی تو اس سے وہ پوچھا کرتے تھے تجھ کو نماز پڑھ کر کیا ملا۔ اسی طرح سودا کی حکایت ہے کہ وہ اپنی بیوی سے ایک دن پوچھنے لگا کہ تو نماز کس واسطے پڑھا کرتی ہے۔ اس نے کہا ہمیں جنت ملے گی۔ تو سودا کیا کہتا ہے کہ جا باؤلی تو وہاں بھی غریبوں، ملانوں، طالب علموں اور جولاہوں کے ساتھ رہے گی۔ اور دیکھ ہم جہنم میں جائیں گے جہاں بڑے بڑے بادشاہ اور وزراء اور امراء ہوں گے۔ فرعون، ہامان، نمرود، شداد، قارون وغیرہ۔ یہ تو سودا کا قصہ ہے مگر آج کل بھی قلوب (۳) کو ٹٹولا جائے تو معلوم ہوگا کہ جتنی وقعت لوگوں کے قلوب میں ایک ہزار روپیہ کی ہے، اس سے نصف بھی دین کی وقعت نہیں ہے نہ ثمرات آخرت کی۔ حالانکہ ان کی وہ قیمت ہے کہ۔

قیمت خود ہر دو عالم گفتۂ　　نرخ بالا کن کہ ارزانی ہنوز

تو نے اپنی قیمت دونوں جہاں بیان کی، نرخ بڑھا ابھی تو ارزاں ہے۔

دونوں جہاں بھی بخدا اس کی قیمت میں کم ہیں اور یہاں سے یہ بھی معلوم ہوگیا کہ جو لوگ قرآن کو تراویح میں اجرت لے کر سناتے ہیں اس میں علاوہ فقہی گناہ کے بے غیرتی بھی کس قدر ہے کہ قرآن کو جو خدا تعالیٰ کا کلام ہے ادنیٰ سی اجرت کے معاوضہ میں سناتے پھریں۔ اور یہ ساری بے قدری اس لیے ہے کہ قرآن سستا مل گیا ہے اس دولت کے حصول میں ہم کو کچھ خرچ کرنا نہیں پڑا۔ اسی کو مولانا فرماتے ہیں۔

اے گراں جاں خوار دیدستی مرا　　زانکہ بس ارزاں خریدستی مرا (۴)

(۱) لوگ بھی اس سے محبت کرنے لگیں گے (۲) فائدہ (۳) دلوں کو (۴) ''اے کاہل تُو نے مجھ کو بے قدر سمجھ رکھا ہے وجہ یہ ہے کہ میں تم کو مفت میں مل گیا ہوں''۔

یعنی قرآن زبان حال سے کہہ رہا ہے کہ مجھے اس واسطے بے قدر کر رکھا ہے کہ میرے حاصل کرنے میں تمہارے کچھ دام نہیں لگے۔

حضرت ابراہیم بن ادہم رحمۃ اللہ علیہ جب کسی فقیر کو فقر وفاقہ کی شکایت کرتے ہوئے دیکھتے تو فرمایا کرتے کہ تم اس کی قدر کیا جانو تم کو گھر بیٹھے یہ دولت مل گئی ہے۔ اس کی قدر ابراہیم بن ادہم سے پوچھ جس نے سلطنت بیچ کر اس کو خریدا ہے۔ اسی طرح ہم نے ایمان کی دولت کو ماں باپ سے لیا ہے۔ بے محنت ومشقت ہم کو مل گئی ہے اس لیے اس کی بے قدری ہے ورنہ خدا کا نام وہ چیز ہے جس کے مقابلہ میں تمام دنیا ہیچ ہے کیونکہ جنت کی سلطنت اسی کے عوض میں ملے گی جس کے سامنے دنیا کی ہزار سلطنتیں بھی گرد ہیں۔ مگر افسوس آج کل دو پیسہ کے برابر بھی خدا کے نام کی قدر نہیں۔ چنانچہ وہ عہدہ دار اپنی بیوی سے پوچھتے تھے کہ تجھ کو نماز سے کیا ملا۔ وہ تو ملنا اس کو سمجھتے تھے جیسے ایک شخص کو ملا کرتا تھا۔

قصہ یہ ہے کہ ایک عہدہ دار رشوت لیا کرتے تھے اور نماز کے بھی بہت پابند تھے حتیٰ کہ فجر کی نماز کے بعد اشراق تک وظیفہ بھی پڑھا کرتے تھے اور یہی وقت مقدمہ والوں سے رشوت طے کرنے کا تھا۔ مقدمہ والے آتے اور اشاروں سے رشوت کی رقم طے ہوتی تھی کیونکہ پیر نے وظیفہ میں بولنے سے منع کر رکھا تھا۔ بس وہ اشاروں سے سو کہتا اور یہ دو انگلیاں اٹھا دیتے کہ دو سولوں گا۔ پھر اشاروں ہی سے کوئی رقم طے ہو جاتی تو یہ مصلی کا کونہ پکڑ کر اٹھا دیتے کہ یہاں روپیہ رکھ دو۔ پھر کوئی دوسرا آتا اور اس سے بھی یوں ہی گفتگو ہوتی۔ غرض یہ ظالم اشراق پڑھ کر کئی سو روپیہ لے کر اٹھتا۔ تو آج کل تو ملنا اسے کہتے ہیں اور اسی واسطے وظیفے بھی پڑھے جاتے ہیں۔ پھر غضب ہے کہ بعض لوگ قرآن پڑھنے میں تو بول پڑتے ہیں اور وظیفے میں نہیں بولتے گویا نعوذ باللہ قرآن کی وقعت وظیفوں کے بھی برابر نہیں۔ یہ کیسی بے قدری ہے۔

اسی جہل کا ایک یہ اثر ہے کہ حدیث وقرآن کی دعاؤں کا لوگوں کے ذہن میں وہ درجہ نہیں جو پیرزادوں کی گھڑی ہوئی دعاؤں کا درجہ ہے چنانچہ جب میں حج کو گیا تھا تو اس وقت میرے ابتدائی کتابوں کے استاد کانپور میں میری جگہ تدریس کے لیے

تشریف لے آئے تھے وہاں ان سے ایک شخص نے اپنے قرض کے لیے وظیفہ پوچھا۔ انہوں نے ایک دعا بتلادی۔ اس نے بڑی رغبت سے یاد کی اورانہوں نے زیادہ رغبت دلانے کے لیے یہ بھی فرمادیا کہ یہ دعا حدیث میں آئی ہے اوراس کی یہ فضیلت ہے۔ بس یہ سن کراس شخص کا منہ پھیکا سا ہوگیا اور کہنے لگے حضرت میں تو کوئی ایسا وظیفہ چاہتا ہوں جو آپ کے پاس سینہ بسینہ چلا آرہا ہو حدیث کی دعا تو عام ہے سبھی پڑھ لیتے ہیں۔ سولوگ آج کل ایسی ہی بے قدری کرتے ہیں۔ ایک شخص مجھ سے خود کہتے تھے کہ میری نماز تو قضاء ہوجاتی ہے مگر پیر نے جو وظیفہ بتایا ہے وہ کبھی قضاء نہیں ہوتا۔ عجیب حالت ہے کہ اول تو دین کی طرف توجہ ہی نہیں اور جو توجہ بھی ہے تو اس خوبصورتی کے ساتھ۔ اسی طرح ان عہدہ دار صاحب کو پیر نے منع کردیا تھا کہ وظیفہ میں بولنا نہیں اس لیے ان کو بولنا تو ناجائز تھا مگر رشوت لینا جائز تھا۔ بلکہ شاید وظیفہ بھی وہ اسی واسطے پڑھتے ہوں کہ رشوت خوب ملے اور رشوت کے لیے بھی نہ سہی تو اس میں تو شک نہیں کہ آج کل وظائف زیادہ تر دنیا کے واسطے پڑھے جاتے ہیں کہ مال میں برکت ہو نوکری مل جائے، قرض اتر جائے رضائے حق کے واسطے بہت ہی کم پڑھے جاتے ہیں۔ میں یہ تو نہیں کہتا کہ دنیا کے کاموں کے لیے وظیفہ پڑھنا ناجائز ہے مگر یہ ضرور کہوں گا کہ دنیا کے لیے اگر چالیس بار پڑھتے ہو تو آخرت کے لیے کم سے کم چار بار تو کوئی وظیفہ پڑھو! مگر اس کی ذرا بھی فکر نہیں۔

دعا اور وظیفہ کا فرق

جب آپ کو دین کی فہم کامل حاصل ہوگی اس وقت میں یہ کہوں گا کہ

از خدا غیر خدا را خواستن ظن افزونی ست کلی کاستن

''خدا تعالیٰ سے غیر خدا کو چاہنا حقیقت میں پستی ہے۔ یہ سلطنت نہیں ہے کہ خدا سے دنیا مانگو بلکہ یہ پست ہمتی اور دناءت ہے'' مگر اس کے دو طریقے ہیں۔ ایک تو دنیا کے واسطے خدا تعالیٰ سے دعا کرنا اور دعا کے ذریعے سے مانگنا یہ مذموم (۱) نہیں ہے بلکہ یہ تو شان عبدیت ہے اور ایک وظیفہ پڑھ کر مانگنا یہ مذموم ہے (۲) اور ان دونوں میں بڑا فرق ہے وہ یہ کہ دعا کرکے مانگنے میں ایک ذلت کی شان ہے اور یہ اس مقصود کے

(۱) برا نہیں ہے (۲) برا ہے

موافق ہے جو بندوں کے پیدا کرنے سے اصل مقصود ہے جس کو حق تعالیٰ نے اس آیت میں بیان فرمایا ہے۔ وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنسَ إِلَّا لِيَعْبُدُونِ میں نے جن وانس کو عبادت کے لیے پیدا کیا ہے (اسی لیے حدیث میں ہے الدعاء مخ العبادۃ کہ دعا عبادت کا مغز ہے) اور میں نے عبادت کو جو اصل مقصود کہا ہے اس میں اصل کی قید اس واسطے لگائی کہ کوئی یوں نہ سمجھے کہ کھانا، کمانا اور دنیا کے کاروبار کرنا ناجائز ہے۔ سو خوب سمجھ لو کہ یہ ناجائز نہیں بلکہ جائز ہے بلکہ ایک درجہ میں مطلوب بھی ہے مگر اصل مقصود نہیں بلکہ تابع مقصود ہے (۱)۔

اس کی ایسی مثال ہے جیسے ایک شخص کھانا پکوائے جس میں پانچ روپے صرف ہوں (۲) تو گو اصل مقصود کی لاگت اس سے کم ہے مگر جب کوئی پوچھتا ہے کہ اس کھانے کی تیاری میں کیا خرچ ہوا ہے تو جواب یہی دیا جاتا ہے کہ پانچ روپے صَرف ہوئے ہیں اور جب وہ تفصیل پوچھے تو آپ کہتے ہیں کہ ایک روپیہ کا گھی اور ایک روپیہ کا آٹا اور ایک روپیہ کا گوشت اور آٹھ آنے کا مصالحہ وغیرہ اور آٹھ آنے کی لکڑیاں کوئلے اور چار آنے پکانے والے کی مزدوری وعلی ہذا۔ اس جواب کو سن کر وہ سائل کہنے لگے کہ کیا آپ لکڑیاں اور کوئلے بھی کھایا کرتے ہیں جو اس کو کھانے کے حساب میں شمار کیا تو بتلایئے کہ آپ کیا جواب دیں گے۔ یقیناً یہی کہیں گے کہ لکڑیاں گو مقصود نہیں مگر مقصود کے تابع ضرور ہیں اس لیے ان کو بھی مقصود کے ساتھ شمار کیا جائے گا۔ تو بعینہ (۳) یہی تعلق دنیا کو آخرت سے ہے کہ گو وہ بھی کسی درجہ میں مطلوب ہے مگر اصل مقصود نہیں بلکہ تابع مقصود ہے۔

اب اگر کوئی شخص صرف دنیا ہی کے جمع کرنے میں لگا رہے۔ اس کو ایسا سمجھا جاوے گا جیسے کوئی کھانا تیار کرے نہیں نہ کھانے کی چیزیں خریدے صرف لکڑیاں گھر میں بھر لے؟ تو بتلایئے اگر کوئی اپنے گھر میں لکڑیاں ہی بھر لے تو اس کو کوئی شخص عاقل کہے گا۔ ہرگز نہیں اسی طرح محض دنیا طلبی میں رہنا بھی عاقل کا کام نہیں اور اگر کوئی کھانے کا سارا سامان کر لے مگر ایندھن نہ خریدے تو اس کو بھی کھانا میسر نہیں ہوسکتا اسی طرح محض دین میں لگے رہنا اور باوجود حاجت دنیا کی مطلق فکر نہ کرنا بھی غیر مطلوب

(۱) مقصود کے تابع ہے (۲) خرچ ہوں (۳) بالکل ایسے ہی

ہے بلکہ اصل مقصود دین کو سمجھے اور اس میں زیادہ مشغول ہو اور کچھ فکر دنیا کی بھی رکھے مگر اس میں منہمک نہ ہو بلکہ اتنا سامان کر لینا چاہئے کہ مثلاً ایک سال کے لیے علی اختلاف الاحوال کافی ہو جائے(۱) کیونکہ الضرورة بقدر الضرورة(۲) اور رفع ضرورت کے لیے اتنا سامان کافی ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ مولوی دنیا چھڑاتے ہیں یہ غلط ہے چھڑاتے کہاں ہیں بلکہ وہ تو دنیا کو دین کا ذریعہ بتاتے ہیں اتنا فرق ہے کہ آپ اسی کو مقصود سمجھتے ہیں اور میں اس کو بقدر ضرورت ضروری کہتا ہوں پس دنیا تابع ہے اور اصل مقصود آخرت ہے اس لیے میں نے اصل کا لفظ بڑھا دیا ہے کہ خلقت عالم(۳) سے اصل مقصود عبادت ہے۔ اب سمجھئے کہ دعا میں ایک خاصہ ہے جس کی وجہ سے دعا کر کے دنیا مانگنا جائز ہے اور وظیفہ میں وہ بات نہیں اس لیے مذموم ہے(۴) دعا کی حقیقت وہ ہے جو عبادت کی روح ہے یعنی تذلل واظہار احتیاج(۵) اور یہ وہ چیز ہے کہ اگر کوئی سادہ طبیعت آدمی کسی بادشاہ یا امیر کو دعا کرتے دیکھے اور دعا کے وقت جو عاجزی کے الفاظ وہ کہہ رہا ہے وہ سنے تو اس کو حیرت ہو جائے گی کہ اللہ یہ شخص بھی اتنا محتاج ہے جو اس عاجزی سے اپنی احتیاج کو ظاہر کر رہا ہے۔

اکبر بادشاہ کی حکایت ہے کہ ایک دفعہ شکار میں وہ کسی طرف رستہ بھول کر جا نکلا۔ وہاں ایک دیہاتی زمیندار تھا اس نے بادشاہ کو پہچانا تو نہیں مگر اپنی کریم النفسی سے اس کی خوب خاطر مدارات کی، اکبر بہت خوش ہوا تھوڑی دیر بعد میں لشکر بھی آملا۔ تب دیہاتی کو معلوم ہوا کہ یہ تو بادشاہ تھا اکبر نے چلتے وقت کچھ دیا بھی اور کہہ دیا کہ جب یہ ختم ہو جاوے ہمارے پاس پھر آجانا اور دربانوں سے کہہ دیا کہ یہ جب آوے روکنا نہیں۔

چنانچہ ایک بار وہ آپہنچا اور اس کو محل میں پہنچا دیا گیا اتفاق سے اکبر اس وقت نماز پڑھ رہے تھے اس دیہاتی کو بڑی حیرت ہوئی کہ یہ بادشاہ ہو کر کسی کے سامنے جھک رہا ہے جب اکبر نماز سے فارغ ہوا اور ہاتھ اٹھا کر دعا کرنے لگے تو دیہاتی کو اور بھی حیرت ہوئی کہ یہ کس سے مانگ رہا ہے، آخر جب وہ دعا سے فارغ ہو کر اس کی طرف

(۱) لوگوں کے احوال چونکہ مختلف ہوتے ہیں اس لیے اپنے حالات وضرورت کے مطابق ایک سال کا خرچ جمع کرنے میں حرج نہیں (۲) ضرورت بقدر ضرورت ہوتی ہے (۳) عالم کی پیدائش سے مقصود عبادت ہے (۴) برا (۵) پستی اختیار کرنا اور ضرورت کا اظہار۔

متوجہ ہوئے تو دیہاتی نے پوچھا کہ تم کس کے سامنے جھکے اور کس سے ہاتھ پھیلا کر مانگ رہے تھے اکبر نے کہا کہ میں خدا تعالیٰ کی عبادت کر رہا تھا اور اس سے اپنی حاجتیں مانگ رہا تھا۔ یہ سن کر دیہاتی پر ایک حالت طاری ہوئی اور کہنے لگا کہ جب خدا تمہاری حاجت پوری کر سکتا ہے تو کیا میری حاجت پوری نہ کرے گا بس میں اب تم سے کچھ نہیں مانگتا میں بھی خدا سے مانگوں گا۔

تو صاحبو! دعا کا یہ رنگ ہے جس سے سراسر احتیاج اور عاجزی ٹپکتی ہے اور وظیفہ میں یہ بات نہیں (بلکہ اکثر تو یہ ہے کہ وظیفہ پڑھ کر لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ وظیفہ کے زور سے ہمارا مقصود ضرور حاصل ہوگا تو اس حالت میں عجز و احتیاج کہاں پس دنیا کے واسطے وظیفہ پڑھنا اور دنیا کے لیے دعا کرنا برابر نہیں)

دعا کا طریق

اس لیے کہ اگر کوئی دنیا کے واسطے دعا مانگے اور یوں کہے کہ اے خدا مجھے سو روپے دے دیجئے تو یہ جائز ہے بلکہ اس میں بھی وہی ثواب ہے جو آخرت کے لیے دعا کرنے میں ہے بشرطیکہ دعا ناجائز کام کے لیے نہ ہو کیونکہ دنیا کے لیے ہر دعا جائز نہیں بلکہ جو شریعت کے موافق ہو وہی جائز ہے مثلاً کوئی شخص ناجائز ملازمت کے لیے دعا مانگے تو یہ جائز نہیں۔ اس کی ایسی مثال ہے کہ جیسے حاکم کے یہاں ایک تو تحصیلداری کی درخواست دینا اور ایک ڈکیتی کی درخواست دینا ظاہر ہے کہ جس کام کو حاکم نے ممنوع قرار دیا ہے اس کی درخواست حاکم سے کرنا اور حاکم کو اس کے حصول کا ذریعہ بنانا بھی ممنوع ہوگا(۱) تو جو دعا حدود شرعیہ سے باہر ہو وہ تو پسندیدہ ہے ہی نہیں پھر اس کو پیش کرنا کیونکر جائز ہو سکتا ہے آج کل لوگ اس کی بھی رعایت نہیں کرتے کہ دعا شریعت کے موافق ہو۔ واقعی بات یہ ہے کہ ہم لوگ بڑی غفلت میں ہیں جس کی وجہ زیادہ تر بے علمی ہے لوگ بعض دفعہ خدا تعالیٰ سے ایسی چیزیں مانگتے ہیں جو خدا تعالیٰ کو ناپسند ہیں چنانچہ اس وقت بہت سی ایسی نوکریاں ہیں جو ناجائز ہیں اور ان کے لیے دعا کرائی جاتی ہے اور اگر وہ مل جائے تو مبارک باد دی جاتی ہے۔ افسوس! کس کس بات کی اصلاح کی جائے۔

(۱) منع ہوگا۔

تن ہمہ داغ داغ شد پنبہ کجا کجا نہم (۱)

اور غضب یہ ہے کہ ایسی ناجائز ملازمتوں کے لیے اہل اللہ سے جا کر دعا کرائی جاتی ہے اور اس سے بڑھ کر یہ کہ مردوں کے پاس جا کر کہتے ہیں کہ آپ ہمارا یہ کام کر دیجئے گویا سارا اختیار ان کے ہاتھوں میں ہے۔ حضرت مولانا شاہ فضل الرحمن صاحب کے پاس ایک شخص آیا اور کہنے لگا کہ حضرت میرا یہ کام کر دیجئے شاہ صاحب نے فوراً حکم دیا کہ نکالو اس مشرک کو کہ یہ مجھ سے کہتا ہے کہ میرا کام کر دیجئے ارے کیا تیرا کام کر دینا میرے اختیار میں ہے۔ بس آج کل لوگ یوں سمجھ لیتے ہیں کہ یہ تسبیح چلانے والے خدا تعالیٰ کے رشتہ دار ہو گئے کہ جو کہہ دیں گے ضرور ہو جائے گا۔ خدا تعالیٰ فرماتے ہیں یَا أَهْلَ الْكِتَابِ لاَ تَغْلُوا فِي دِينِكُمْ (۲) اس میں غلو فی الدین سے منع فرمایا گیا ہے پس گو حضرات اولیاء کی تعظیم ضروری ہے اور دین میں داخل ہے مگر اس کے یہ معنی نہیں کہ ان کی ایسی تعظیم کی جائے کہ خدا تعالیٰ کی توہین ہونے لگے اور شرک لازم آجائے۔

دیکھو اگر کوئی حاکم کے پاس جا کر سر رشتہ دار کو بھی سلام کر لے تو اس کا مضائقہ نہیں لیکن اگر اس سے وہ باتیں کہنے لگے جو حاکم سے کہنا چاہئیں مثلاً یوں کہے کہ سر رشتہ دار صاحب بس سارا معاملہ آپ ہی کے ہاتھ میں ہے آپ جو چاہیں کر سکتے ہیں اور اس کی ویسی ہی تعظیم کرنے لگے جیسے حاکم کی جاتی ہے تو کیا حاکم اس سے خوش ہوگا یقیناً حاکم اس شخص کو دربار سے نکال دے گے اور یقیناً سر رشتہ دار بھی ایسی تعظیم گوارا نہیں کر سکتا اور جو گوارا کرے گا تو وہ بھی دربار سے نکالا جائے گا۔ اب بتلاؤ کہ جو معاملہ خدا تعالیٰ سے کیا جاتا ہے وہ غیر خدا کے ساتھ کیوں کر پسند ہو سکتا ہے یقیناً اس سے حق تعالیٰ ناخوش ہوتے ہی ہیں وہ بزرگ بھی ناراض اور ناخوش ہوتے ہیں جن کی ایسی تعظیم کی جاتی ہے پھر حیرت ہے کہ لوگ بزرگوں کے مزارات پر جا کر ایسے بیہودہ کلمات سے ان کا دل دکھاتے ہیں غرض ناجائز ملازمتوں کے لیے زندوں اور مردوں کو جا کر دق کرتے ہیں (۳) پھر زندوں میں بعض تو صاف ہوتے ہیں جو ان کے منہ پر کہہ دیتے ہیں کہ ہم ناجائز کام

(۱) ''تمام بدن داغ داغ ہو گیا پھوئے کہاں کہاں رکھیں'' (۲) ''اے اہل کتاب دین میں غلو مت کرو'' سورہ نساء: ۱۷۱ (۳) پریشان کرتے ہیں

کے لیے دعا نہیں کریں گے۔ ان کو تو بدمزاج اور سخت کہہ کر بدنام کیا جاتا ہے اور اکثر اپنے اخلاق سے کہہ دیتے ہیں کہ ہاں دعا کریں گے یہ بہت خوش اخلاق شمار ہوتے ہیں اور اس وقت اہل الرائے کی رائے یہی ہے کہ علماء کو ایسے ہی اخلاق چاہئیں جس کا مطلب یہ ہے کہ وہ حق بات کو ظاہر نہ کیا کریں۔ غرض بعض اہل اللہ اپنے اخلاق سے مجمل وعدہ بھی کر لیتے ہیں مگر لوگوں کو یہ معلوم نہیں کہ وہ دعا کس طرح کرتے ہیں ذرا خلوت (۱) میں کبھی ان کی دعاؤں کو سنو تو معلوم ہو اور بعض تو خلوت میں خدا تعالیٰ کے سامنے بھی اخلاق برتتے ہیں مگر یہ غیر محقق ہیں اکثر اہل اللہ خلوت میں یوں دعا کرتے ہیں کہ یا اللہ! اگر یہ ملازمت شریعت کے موافق ہو اور اس شخص کے دین کو مضر نہ ہو تو اسے نصیب کر دیجئے ورنہ ہرگز نہ دیجئے۔

مولانا شاہ فضل الرحمن صاحب سے ایک شخص نے آکر عرض کیا کہ حضرت میرے مقدمہ کے واسطے دعا کیجئے اسی وقت دوسرا فریق بھی آیا اس نے بھی دعا چاہی۔ اس مقام پر اس کلچھڑی کو سلجھانا (۲) ہر ایک کا کام نہیں اب یا تو دوسرے فریق سے انکار کریں تو ترجیح بلا مرجح لازم آتی ہے اور اس سے بھی وعدہ کریں تو کس طرح کریں ہاں جس کو خدا تعالیٰ نور باطن عطا فرماویں وہ اس گتھی کو سلجھا سکتا ہے چنانچہ شاہ صاحب نے اس وقت دعا کی کہ اے اللہ! جس کا حق ہو اسے مل جاوے لیجئے دونوں کا پورا ہو گیا۔ سو مولانا نے تو جلوت ہی میں دعا کر دی باقی اور بزرگ بھی گو جلوت میں تم سے کیسا ہی وعدہ کر لیں خلوت میں بھی وہ اسی طرح دعا کرتے ہیں کہ اگر یہ کام خلاف شریعت نہ ہو تو پورا ہو جائے ورنہ ہرگز پورا نہ ہو وجہ یہ ہے کہ وہ خدا کے مقرب ہیں پھر وہ خدا تعالیٰ کی مرضی کے خلاف کوئی دعا کیسے کر سکتے ہیں بلکہ عوام الناس تو خدا تعالیٰ سے کچھ کھلے ہوئے بھی ہوتے ہیں (جیسے بعض دیہاتی حکام کے سامنے بے تکلف باتیں کر لیتے ہیں) اور یہ حضرات نہایت ہیبت زدہ ہوتے ہیں وہ ناجائز امور کے لیے تو کیا دعا کرتے مباح امور میں بھی دعا کرتے ہوئے ان کی یہ حالت ہوتی ہے۔

احب مناجات الحبیب باوجه ولکن لسان المذنبین کلیل (۳)

(۱) تنہائی (۲) اس گتھی کو سلجھانا (۳) ''مناجات حبیب کے پسندیدہ بہت سے طریقے ہیں، مگر گناہگاروں کی زبان توتلی اور کند ہے''

بعض دفعہ وہ بہت کچھ مانگنا چاہتے ہیں لیکن اپنی خطاؤں کے استحضار سے زبان سے کچھ نکلتا نہیں حضرات مغفرت کی دعا کس قدر محبوب اور سراپا محمود ہے مگر اس میں بھی بعض دفعہ استحضار ذنوب (۱) کے سبب ان کی زبان رک جاتی ہے گو پھر امر کی وجہ سے دعا کرتے ہیں اور کرنا چاہئے کیونکہ وہ صاحب حال ہونے کے ساتھ صاحب عرفان بھی ہوتے ہیں اس لیے امر کی وجہ سے دعا کرتے ہیں اور اپنے جی کو سمجھاتے ہیں کہ شرماویں کس سے اور شرم کی وجہ تو یہی ہے کہ ہم اپنے کو ناپاک سمجھتے ہیں کہ اس وجہ سے اس دربا میں کچھ عرض کرنے کے قابل اپنے کو نہیں سمجھتے مگر پھر دور دور رہ کر پاک کیسے ہوں گے پاک ہونا بھی تو حاضری دربار ہی پر موقوف ہے اب اگر حاضری اس پر موقوف ہو کہ پہلے پاک ہولیں تو دور لازم آتا اس لیے وہ شرم کو بالائے طاق رکھ کر طبیعت پر جبر کر کے دعا کرتے ہیں۔

مولانا نے ایک حکایت لکھی ہے کہ آلودہ نجاست دریا پر سے گزرا دریا نے کہا کہ میرے اندر چلا آ اس نے جواب دیا کہ میں ناپاک اور تُو پاک وصاف میں تجھ تک کیسے آؤں پاک ہو کر آؤں گا دریا نے ہنس کر کہا کہ اے بے وقوف پاک ہونے کا طریق یہی ہے کہ تو اسی حالت ہی میں چلا آ مجھ سے دور رہ کر تو پاک ہی نہیں ہوسکتا ایک بار تو ناپاکی کی حالت ہی میں چلا، پھر پاک ہو کر بھی آنا نصیب ہوگا اور جو اس انتظار میں رہا کہ پہلے پاک ہولوں پھر پانی کے پاس جاؤں گا تو عمر بھر نہ تجھے پاکی نصیب ہوگی نہ پانی کا قرب نصیب ہوگا۔

شیطانی اغوا

صاحبو! اسی طرح خدا تعالیٰ کے دربار میں آنے کے لیے تم اس کا انتظار نہ کرو کہ پہلے دنیا کے جھگڑوں سے فارغ ہولیں پھر یک سو (۲) ہو کر خدا کی یاد میں لگیں گے کیونکہ یوں تو ساری عمر گزر ہی جائے گی اور تم کو خدا کے ساتھ علاقہ (۳) نصیب نہ ہوگا۔ یہ شیطانی اغوا ہے (۴) کہ اس نے علم کے پیرایہ میں جہل کے اندر مبتلا کر رکھا ہے کہ عام لوگوں کو یہ پٹی پڑھادی ہے کہ بیٹے بیٹیوں کی شادی کر کے بہت سی جائیداد اور روپیہ حاصل کر کے پھر اللہ کی یاد میں لگنا اس وقت تو دل دنیا کی گندگیوں سے ملوث ہے ان

(۱) گناہوں کے استحضار کی وجہ سے (۲) پوری توجہ سے (۳) تعلق (۴) دھوکا۔

سے پاک ہوکر آنا مگر ان لوگوں کو عمر بھر بھی خدا کی یاد نصیب نہیں ہوتی کیونکہ دنیا کے تعلقات بدون خدا سے علاقہ (۱) پیدا کئے قطع ہو ہی نہیں سکتے دنیا کے کاموں کی یہ حالت ہے کہ۔

لا ینتھی ارب الا الی ارب (۲)

ان کی انتہا ہی کہیں نہیں ہے ایک کام کے بعد دوسرا کام نکلتا چلا جاتا ہے بس ان لوگوں کی ہمیشہ وہ حالت رہتی ہے۔

ہر شعبے گویم کہ فردا ترک ایں سودا کنم باز چوں فردا شود امروز را فردا کنم (۳)

روز یہی کہتے رہتے ہیں کہ کل کو یہ کام چھوڑ دیں گے مگر جب کل ہوتی ہے پھر وہی حال ہوجاتا ہے تو صاحبو! اس کا انتظار نہ کیجئے آپ جس حال میں ہیں اس حال سے چلے آیئے دور رہ کر پاک ہونے کا انتظار نہ کیجئے۔ پاک ہونے کا طریقہ بھی یہی ہے کہ ایک بار ناپاکی کی حالت ہی میں آجایئے۔ اس لیے فرماتے ہیں:

باز آ باز آ ہر آنچہ ہستی باز آ گر کافر و گبر و بت پرستی باز آ
ایں درگہ ما درگہ نو میدی نیست صد بار اگر توبہ شکستی باز آ (۴)

ان شاء اللہ خدا کے دربار میں حاضر ہونے سے بہت جلد یہ داغ دھل جاوے گا اور ایک دن یوں ہی بیڑا پار ہوجائے گا۔ بہت لوگ بزرگوں کے پاس اسی خیال سے نہیں جاتے کہ یہ دنیا کا پاخانہ لے کر ان کے پاس کیا جاویں۔ وہ اپنے دل میں کیا کہیں گے۔

صاحبو! اس کا وسوسہ ہرگز نہ لاؤ۔ وہ حضرات تخلقوا باخلاق اللّٰہ (۵) سے متصف ہوتے ہیں۔ وہ کسی آنے والے کو حقیر نہیں سمجھتے۔ وہ عیب پوش (۳) اور کریم النفس ہوتے ہیں۔ بلکہ بخدا ان کی نظر میں اپنے سے زیادہ کوئی بھی ذلیل نہیں ہوتا۔ پھر وہ کسی کو نظر حقارت سے کیا دیکھتے اس لیے تم اس ناپاکی کی سمیت ہی ان کے پاس چلے آؤ۔

مجھے ایک صاحب کی حالت تو نہیں مگر اس کی بناء بہت پسند آئی وہ جونپور سے میرے پاس بیعت ہونے آئے تھے۔ اور اس حال سے آئے کہ پاجامہ ٹخنوں سے نیچے

(۱) خدا سے تعلق قائم کئے بغیر (۲) ''ایک حاجت گئی دوسری حاجت پیش آگئی'' (۳) ''ہر رات کو یہی کہتا ہوں کہ کل یہ کام چھوڑ دوں گا مگر جب کل ہوتی ہے تو اس کو آئندہ کل پر چھوڑ دیتا ہوں'' (۴) ''واپس آ واپس آ جو کچھ بھی تُو ہے واپس آجا ہمارا دربار ناامیدی کا دربار نہیں ہے سو بار اگر تو نے تُو بہ توڑی ہے تو واپس آجا'' (۵) ''اللہ تعالیٰ جیسے اخلاق اختیار کرو'' لم أجد الحدیث فی ردلو سوعة اطراف الحدیث النبوی الشریف (۶) عیب چھپاتے ہیں۔

اور ڈاڑھی منڈی ہوئی، مونچھیں خوب بڑھی ہوئیں اور آ کر مجھ سے اپنے سب حالات کہہ دیئے پھر بیعت کی درخواست کی، میں نے بعد مغرب کا وقت مقرر کر دیا وہ دن جمعہ کا تھا بھلے مانس نے اس دن بھی حجامت بنوائی تو جو کچھ بال ڈاڑھی کے نکل آئے تھے وہ بھی منڈا دیئے یہ حرکت مجھے بہت ناگوار ہوئی کہ یہاں آ کر بھی انہوں نے اس گناہ کو نہ چھوڑا مگر بعد نماز جمعہ کے انہوں نے اپنے اس فعل کی جو بناء بیان کی اس پر مجھے وجد آ گیا کہنے لگے کہ غالباً آپ کو آج میرا ڈاڑھی منڈانا ناگوار ہوا ہوگا۔ میں نے کہا بے شک! کہنے لگے کہ خیال مجھے بھی ہوا تھا کہ آپ کو ناگوار ہوگا مگر میں نے چاہا کہ طبیب کے سامنے اپنے مرض کی اصلی حالت صاف صاف ہی ظاہر کر دوں اس لیے میں نے اس شکل سے آپ کو پیش کر دیا اب آپ جو تصرف چاہیں مجھ میں فرمائیں میں سب کے لیے حاضر ہوں۔

استقلال کی ضرورت

گو وہ فعل مجھے ناگوار ہوا مگر اس بناء کی قدر ہوئی اور معلوم ہو گیا کہ اس شخص پر صدق کا حال غالب ہے مگر بوجہ جہل کے بری طرح ظاہر ہوا مگر واقعی میں اس کے صدق کی قدر کرتا ہوں اور یہ ایسی قدر ہے جیسے حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک چور کی قدر کی تھی۔ انہوں نے ایک شخص کو سولی پر لٹکا ہوا دیکھا تھا، ساتھ والوں سے پوچھا کہ اس کو سولی کیوں دی گئی لوگوں نے کہا کہ حضرت یہ بڑا پکا چور تھا ایک بار اس نے چوری کی تو دایاں ہاتھ کاٹا گیا پھر باز نہ آیا اور دوبارہ چوری کی تو بایاں پیر کاٹا پھر باز نہ آیا تو قید کر دیا گیا اس نے قید خانہ میں بھی چوری کی تو حاکم نے سولی کا حکم دیا، یہ سن کر حضرت جنید نے دوڑ کر اس کے قدم چوم لئے اہل ظاہر نے اعتراض کیا کہ آپ ایک ایسے پکے چور کے قدم چومتے ہیں فرمایا میں نے چور کے قدم نہیں چومے بلکہ اس کے استقلال کے قدم چومے ہیں کہ وہ جیسا بھی کچھ تھا اپنی طلب کا پکا تھا۔ اس کا محبوب گو کیسا ہی برا تھا مگر اس نے اس کے پیچھے جان دے دی اس کا یہ حال تھا کہ

دست از طلب ندارم تا کام من برآید یا تن رسد بجاناں یا جاں زتن برآید(۱)

(۱) ''طلب سے ہاتھ نہ روکوں گا جب تک میرا مقصد پورا نہ ہو جائے بدن یا تو محبوب کے پاس پہنچ جائے یا جان تن سے نکل جائے''

میں اس کے استقلال کی قدر کرتا ہوں۔ اے لوگو! اگر ہم کو حق پر ثابت قدم رہنے میں ایسا استقلال حاصل ہوجائے تو ہمارا کام بن جائے۔ دیکھئے حضرت جنیدؒ نے اس شخص کے استقلال کی قدر کی گو اس استقلال کی صورت بری تھی اسی طرح گو ان صاحب نے ایک بری حرکت کی ڈاڑھی منڈائی مگر یہ حرکت چونکہ صدق پر مبنی تھی اس لیے مجھے اس کی قدر ہوئی (کیونکہ ایسے سچے اور صاف دل آدمی سے یہ امید قوی ہوتی ہے کہ وہ بیعت کے وقت جو کچھ اقرار کرے گا سچے دل سے کرے گا پھر اس کے خلاف نہ کرے گا) چنانچہ ان صاحب نے تھانہ بھون سے جاکر پھر عمر بھر ڈاڑھی نہیں منڈائی بلکہ ایک وقت میں ان کی اتنی بڑی ڈاڑھی ہوگئی تھی کہ دیکھنے والے پہچانتے بھی نہ تھے کہ یہ وہی شخص ہے جو پہلے بالکل آزاد رند تھا غرض وہ پورے نیک صالح بن گئے۔ (بات یہ ہے کہ صفات حمیدہ ہر حال میں حمیدہ ہیں جس میں کوئی صفت حمیدہ ہوتی ہے گو ایک وقت میں بری صورت سے اس کا ظہور ہورہا ہو مگر جب اصلاح ہوگی تو کامل ہوگی۔ خوب سمجھ لو) تو میں کہتا ہوں کہ آپ کو اس شخص کی طرح گندگی اور بدحالی میں اپنے کو کسی بزرگ کے سپرد کردینا چاہئے اس کا خیال نہ کیجئے کہ اس صورت سے ہم بزرگوں کے پاس کیسے جائیں۔

مقام دعا

یہ گفتگو اس پر چلی تھی کہ بعض دفعہ اہل اللہ کو دعائے مغفرت سے بھی شرم آتی ہے مگر وہ اس سے رکتے نہیں بلکہ وہ دل کو سمجھاتے ہیں کہ شرم کس سے کریں اگر اسی شرم میں رہے اور خدا تعالیٰ سے دعا نہ کی تو یہ ناپاکی کیوں کر دھلے گی تو جب وہ حضرات امور مباح کی دعا[1] سے بھی شرماتے ہیں (گو اس پر عمل نہ کریں) تو آپ کا ناجائز کاموں کے لیے تو کیوں دعا کی ہمت کریں گے اس لیے زندہ یا مردہ بزرگوں سے ایسی دعا کرانا محض بے سود اور ان کو تکلیف دینا ہے پس ناجائز دعائیں تو مستثنیٰ ہیں رہی جائز دعا چاہے دنیا ہی کی کیوں نہ ہوں وہ تو عبادت ہے چنانچہ حدیث میں ہے۔ الدعاء مخ العبادۃ (دعا عبادت کا مغز ہے) کیونکہ دعا میں تذلل اور عاجزی کی شان ہوتی ہے دعا کرنے والا

(۱) جائز کام کے لیے دعاء کرنے سے

اپنے کو ذلیل ومحتاج سمجھ کر دعا کرتا ہے۔

بخلاف اس کے جو وظیفہ پڑھتا ہے اس کی حالت تذلل کی نہیں ہوتی بلکہ اس کی حالت دعوے کی ہوتی ہے وہ یہ سمجھتا ہے کہ وظیفہ سے کامیابی ضروری ہے۔ان کے مکالمات سے یہ بات ظاہر ہے چنانچہ وہ کہا کرتے تھے کہ حضرت ایسا وظیفہ بتلایئے کہ تیر بہدف ہو اور اگر کسی وظیفہ کی نسبت یہ لکھ دیا جائے کہ یہ مجرب ہے تو اس پر ایسا بھروسہ ہوجاتا ہے کہ گویا تخلف (۱) ہوگا ہی نہیں تو چونکہ اس میں دعویٰ کی شان ہے اس لیے یہ ناپسند ہے مگر آج کل اکثر لوگ دعا کو چھوڑ کر وظائف پڑھتے ہیں گو ان کا پڑھنا جائز تو ہے (اگر ان میں کوئی بات خلاف شریعت نہ ہو) مگر اس میں ثواب کچھ نہ ہوگا کیونکہ ثواب کے لیے یہ قاعدہ ہے۔ انما الاعمال بالنیات (۲) اور وظائف میں ثواب کی نیت نہیں ہوتی بلکہ محض دنیا ملنے کی نیت ہوتی ہے اس لیے ثواب کچھ نہ ہوگا بخلاف دعا کے کہ وہ اپنی ذات سے عبادت ہے حتی کہ اس میں اگر دنیا مانگی جائے تب بھی شریعت اس کو عبادت کہتی ہے چنانچہ خود شریعت نے اس کو دنیا مانگنے کا طریق تجویز فرمایا ہے پس دنیا کی نیت کرنا دعا کے منافی نہیں کیونکہ احادیث میں دنیا کی نیت سے بھی دعا کرنے کا حکم ہے۔ مثلاً ایک حدیث میں ہے۔ واسئلوا اللّٰہ العافیۃ (۳) کہ اللہ تعالیٰ سے عافیت کی دعا مانگو اسی طرح حصول رزق وحصول غنا واداء دین (۴) وغیرہ کے لیے بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دعائیں تعلیم فرمائی ہیں اور اگر احادیث میں غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی دنیوی راحت کو نہیں چھوڑا جس کے لیے کوئی دعا نہ بتلائی ہو اور کسی مصیبت کو نہیں چھوڑا جس سے پناہ مانگنے کا طریقہ نہ بتلایا ہو بلکہ راحت ومصیبت کے علاوہ بھی ہر حالت کے متعلق ایک نہ ایک دعا آپ نے مقرر فرمائی ہے۔ مثلاً گھر میں آنا گھر سے باہر جانا، سونا، جاگنا، اٹھنا، بیٹھنا، بیمار کی عیادت کرنا، مسجد میں جانا اور نکلنا، بازار میں جانا، سفر شروع کرنا، سفر میں کسی جگہ اترنا پھر وطن کو واپس آنا بیت الخلاء وہاں

(۱) اس کے خلاف ہوگا ہی نہیں (۲) ''اعمال کا ثواب نیت پر موقوف ہے'' الصحیح للبخاری: ۱/ ۲، ۸/ ۱۷۵، ۹/ ۲۹ سنن الترمذی: ۱۶۴۷، سنن ابن ماجہ: ۴۲۲۷ (۳) الصحیح لمسلم کتاب الجہاد: ۲۰ (۴) حصول مال اور قرض کی ادائیگی کے لیے

سے نکلنا خوشی ورنج کی بات دیکھنا، چاند دیکھنا وغیرہ وغیرہ۔ سب کے لیے احادیث میں الگ الگ دعائیں وارد ہیں تو دنیا کے لیے دعا مانگنا بھی عبادت اور طاعت ہے بخلاف عملیات کے کہ وہ دین کے لیے ہوں تو اطاعت ہیں ورنہ نہیں۔ اس سے آپ کو معلوم ہوا ہوگا کہ دعا زیادہ قابل توجہ ہے مگر اس وقت بالکل برعکس معاملہ ہورہا ہے کہ وظیفے کی قدر دعا سے زیادہ ہے بلکہ قرآن سے بھی زیادہ قرآن پڑھتے ہوئے تو بات چیت کرلیتے ہیں مگر وظیفے میں بولنا حرام سمجھتے ہیں جیسے وہ عہدہ دار صاحب وظیفہ میں ہوں کیا کرتے اور اشاروں سے رشوت کی مقدار طے کیا کرتے تھے اور جب اشراق کی نماز کو کھڑے ہوتے تو اس سے پہلے کئی سو روپے مصلے کے نیچے آجاتے تھے یہ قیمت تھی ان کی نماز کی آج کل تو اس کو ملنا کہتے ہیں اور اسی اصطلاح کے موافق وہ دوسرے عہدہ دار اپنی بیوی سے پوچھتے تھے کہ تجھے نماز پڑھنے سے کیا ملتا ہے۔ چونکہ لوگ آج کل دینی ثمرات (۱) کو ثمرات نہیں سمجھتے اس لیے ضرورت ہوتی ہے ان ثمرات کو تفصیل سے بیان کرنے کی چنانچہ میں نے اسی واسطے کل کے بیان میں ان کو ذرا تفصیل سے بیان کردیا تھا ورنہ اصلی مقصود ومحتاج تفصیل نہ تھا اس کا حاصل تو صرف اتنا ہے کہ ہم دین کو اختیار کرکے خدا تعالیٰ کے محبوب ہوجاویں گے یہ اس آیت کا جزو تھا جس کو مقصود کہنا چاہئے اور اس کا بیان کل ہوچکا اب اس کا ایک دوسرا جزو ہے یعنی طریق کی تفصیل اس کو آج بیان کیا جائے گا اور ممکن ہے کہ آج کا بیان کل کے برابر مفصل مطول نہ ہو کیونکہ اس وقت کچھ طبیعت مضمحل ہے مگر ضروری اجزاء ان شاء اللہ ضرور بیان ہوجاویں گے اور ایسی تفصیل ہوجاوے گی جس سے کچھ بے خبری دور ہوجاوے۔ یہ تو آپ کو معلوم ہوچکا کہ یہ آیت دو جزو پر مشتمل ہے ایک مقصود دوسرے طریق۔ مقصود کا بیان وعظ سابق میں ہوچکا۔ اب سمجھئے کہ طریق مقصود کیا ہے وہ دو چیزیں ہیں۔ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ کیونکہ حق تعالیٰ یہی تو فرماتے ہیں کہ جو لوگ ایمان لائیں اور نیک کام کریں ان کے لیے حق تعالیٰ محبوبیت پیدا کردیں گے جس میں محبوبیت کو ایمان وعمل صالح پر مرتب کیا گیا ہے تو مقصود اور نتیجہ تو ود ہے (۲) اور ایمان وعمل صالح اس کے ترتیب کی شرط ہے یہی حاصل ہے طریق ہونے کا اس سے ایک بات تو

(۱) فوائد کو (۲) محبت

یہ معلوم ہوئی کہ جو محبوب مقبول بننا چاہے اس کو پہلے ایمان لانا اور عمل صالح اختیار کرنا چاہئے اور یہاں سے یہ ثابت ہوگیا کہ جب ایمان وعمل صالح مقبولیت ونجات کا طریق ہے تو بدون اس کے تمام نسبتیں نجات کے لیے ناکافی ہیں۔ مثلاً کسی بزرگ کی اولاد ہونا یا اپنے پاس کسی بزرگ کا تبرک ہونا یہ تنہا نجات کے لیے کافی نہیں۔

تبرکات کا مسئلہ

صاحبو ہمیں بزرگوں کے تبرکات سے انکار نہیں مگر ان کی اصل اتنی ہے جیسے ایک مثال سے واضح ہوگا اور مجھے مثال دیتے ہوئے شرم بھی آتی ہے کہ ایک دینی مسئلہ کے لیے دنیا کی مثال دوں مگر کیا کیا جاوے کہ آج کل لوگوں کے ذہن میں خدائی معاملات کی اتنی قدر نہیں جتنی دنیوی معاملات کی قدر ہے اس لیے جب کسی خدائی معاملہ کو دنیوی معاملہ سے مطابق کر دیا جاتا ہے تو وہ جلدی لوگوں کے ذہن میں آجاتا ہے اس لیے میں شرماتا ہوا مثال دیتا ہوں کہ ان تبرکات کا اتنا اثر ہے جیسے دو شخصوں نے بی اے کا امتحان پاس کیا ہو اور نوکری کی درخواست دی ہو مگر ان میں ایک تو ایسا ہے جس کا خاندان خیر خواہ سرکار ہونے میں مشہور ہے اور دوسرا ایسا نہیں تو ان دونوں میں اول ملازمت سے وہ کامیاب ہوگا جس کا خاندان خیر خواہ سرکار ہے اور اگر دونوں ساتھ ہی ملازم ہو جائیں تو اس شخص کو بڑا عہدہ ملے گا اور دوسرے کو اس سے کم غرض معزز خاندان والے کا ضرور لحاظ ہوتا ہے خواہ جلدی کامیاب ہونے میں یا بڑا عہدہ میں کیونکہ وہ ایسے خاندان کی طرف منسوب ہے جو خیر خواہ سرکار ہے لیکن اگر یہ نرا صاحب انتساب (۱) ہی ہو اور کوئی امتحان اس نے پاس نہ کیا ہو اس صورت میں اس کو یہ کہنا مفید نہ ہوگا کہ پدر من سلطان بود (۲) بلکہ اس کے جرائم پر دوسروں سے زیادتی قوی مقدمہ قائم ہوگا اور اس سے کہا جائے گا افسوس تم باوجود حقوق سلطنت سے واقف ہونے کے سلطنت کی مخالفت کرتے ہو تم تو حکومت کے آشنا تھے اور تمہارے تو بچہ بچہ کی زبان پر حکومت کے حقوق احسانات کا تذکرہ تھا تجھ پر کیا مار آئی جو مخالفت قانون پر پیش قدمی کرنے لگے تو عجیب نہیں کہ اس شخص کے جرم پر ایسا سنگین مقدمہ قائم ہو جو ایک جلاہے دھوبی کے جرم پر نہ قائم ہو اور یہ حکومت

(۱) صرف صاحب نسبت ہو کہ کسی بڑے شخص کی اولاد ہو (۲) میرا باپ بادشاہ تھا

کی نظر میں زیادہ مبغوض (۱) وقابل نفرین قرار پائے چنانچہ واقعات اس پر شاہد ہیں۔

اسی طرح بزرگوں کی طرف انتساب (۲) سے یہ نفع ضرور ہوتا ہے کہ یہ شخص اگر ایمان وعمل صالح اختیار کرے تو دوسروں سے جلدی کامیاب ہوتا بڑے درجہ میں پہنچ جاتا ہے لیکن اگر یہ سرکشی سے پیش آوے تو اس وقت نرا انتساب (۳) کافی نہ ہوگا۔

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شفقت

اس وقت مجھے استاد علیہ الرحمۃ کا ایک ارشاد یاد آیا جو ایک حدیث کی شرح میں انہوں نے فرمایا تھا اول میں حدیث سنا دوں۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانے میں ایک منافق تھا عبداللہ بن ابی یہ رئیس المنافقین تھا مگر اس کے لڑکے صحابی اور مومن مخلص تھے جب اس منافق کا انتقال ہوا تو اس کے لڑکے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ یا رسول اللہ میرے باپ کا انتقال ہوگیا ہے اس کے کفن کے لیے اپنا کرتہ عطا فرما دیجئے شاید اس کی برکت سے خدا اس کی مغفرت فرمائے۔ حضور نے اپنا کرتہ دے دیا اور تجہیز وتکفین میں شریک ہوئے حتی کہ نماز جنازہ بھی پڑھانا چاہی۔ اس وقت عمرؓ کو جوش آگیا انہوں نے حضور کی چادر مبارک پکڑ لی کہ آپ کس کی نماز پڑھنا چاہتے ہیں ایک منافق کی جن کے بارے میں حق تعالیٰ فرماتے ہیں: اسْتَغْفِرْ لَهُمْ أَوْ لاَ تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ إِن تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ سَبْعِينَ مَرَّةً فَلَن يَغْفِرَ اللهُ لَهُمْ (۴) یعنی چاہے آپ منافقین کے لیے ستر دفعہ بھی دعا واستغفار فرمائیں خدا تعالیٰ ان کو نہ بخشیں گے۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ حق تعالیٰ نے مجھ کو استغفار سے منع نہیں فرمایا اور اگر مجھے معلوم ہوجائے کہ ستر دفعہ سے زیادہ استغفار کرنے سے ان کی مغفرت ہوجائے گی تو میں زیادہ استغفار کرلوں گا۔ یہ سن کر حضرت عمر رضی اللہ عنہ خاموش ہوگئے اور حضور نے جنازہ کی نماز پڑھادی۔ واقعی حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بھی کیا عجیب شفقت ورحمت تھی کہ دشمنوں سے رحمت میں آپ کو دریغ نہ تھا صاحبو! ہم بڑے خوش قسمت ہیں کہ ہم کو ایسے رحیم وکریم پیغمبر (صلی اللہ علیہ سیدی وروحی وسلم)

(۱) ناپسندیدہ اور قابل نفرت (۲) نسبی تعلق ہونے سے یہ فائدہ ضرور ہوتا ہے (۳) خالی نسبت کافی نہ ہوگی (۴) ”آپ خواہ ان کے لیے استغفار کریں یا ان کے لیے استغفار نہ کریں۔ اگر آپ ان کے لیے ستر بار بھی استغفار کریں گے تب بھی اللہ ان کو نہ بخشے گا“ سورۃ توبہ: ۸۰

نصیب ہوئے ہمیں تو آپ سے بہت کچھ امیدیں ہیں۔

نماند بعصیاں کسے در گرو کہ دارد چنیں سید پیش رو(۱)

جب دشمنوں پر بھی آپ کی یہ رحمت ہے تو اپنے غلاموں پر تو کیا کچھ ہوگی۔

غرض آپ نماز پڑھ چکے اور دفن میں بھی شریک ہوئے اور اس منافق کے قبر میں رکھے جانے کے بعد حضور ﷺ نے اپنا لعاب مبارک بھی اس کے منہ میں ڈال دیا اس کے بعد یہ آیت نازل ہوئی۔ وَلاَ تُصَلِّ عَلَى أَحَدٍ مِّنْهُم مَّاتَ أَبَدًا وَلاَ تَقُمْ عَلَى قَبْرِهِ إِنَّهُمْ كَفَرُوا بِاللّهِ وَرَسُولِهِ وَمَاتُواْ وَهُمْ فَاسِقُونَ (۲) اور ان میں کوئی مرجائے تو اس پر کبھی نماز نہ پڑھئے اور نہ اس کی قبر پر کھڑے ہوئے کہ انہوں نے اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے ساتھ کفر کیا ہے اور وہ آمد حالت کفر میں مرتے ہیں۔ جس میں منافقین پر نماز جنازہ پڑھنے اور ان کے دفن وغیرہ میں شرکت کرنے کی صاف صاف ممانعت ہے حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ مجھے بعد میں بڑی ندامت وشرمندگی ہوئی کہ میں نے حضور ﷺ کے ساتھ کیسی جرات کی آپ کو ایک کام سے روکنے لگا (میرا کیا منصب تھا حضور ﷺ تو سب سے زیادہ ہر ایک بات کو جاننے والے ہیں)

بغیر ایمان بخشش نہیں

خیر یہ تو ایک واقعہ تھا اس میں بہت گفتگو اور کلام ہے کہ آپ نے باوجود فَلَنْ يَّغْفِرَ اللّهُ لَهُمْ (۳) وارد ہو چکنے کے پھر اس منافق کی نماز کیوں پڑھی مگر یہ تو طالب علمانہ مباحث ہیں طالب علم ان کو خود حل کرلیں گے مگر اس میں اس بات کا بتلانا مقصود ہے کہ حضور ﷺ نے اس منافق کو اپنا کرتہ کیوں پہنایا اور اس کے منہ میں لعاب دہن مبارک کیوں ڈالا۔ شراح حدیث نے تو یہ لکھا ہے کہ حضور ﷺ نے اس کے بیٹے کی خاطر سے جو مومن مخلص صحابی تھے یہ سب کچھ کیا (تاکہ ان کو معلوم ہوجائے کہ حضور ﷺ کی طرف سے اس کی نجات کی سعی (۴) میں کوئی کوتاہی نہیں رہی۔ آپ ﷺ نے

(۱) ''وہ شخص گناہوں کی وجہ سے دوزخ میں نہیں رہے گا جو ایسا سردار اور پیش رو رکھتا ہو'' (۲) سورہ توبہ: ۸۴

(۳) ''اللہ تعالیٰ ان کو ہرگز نہ بخشیں گے'' (۴) کوشش

دعا بھی کردی نماز بھی پڑھ دی، اپنے تبرکات بھی عطا فرما دیئے اب بھی اگر اس کی مغفرت نہ ہو تو یہ خود اسی کا قصور ہے) اور بعض نے کہا ہے کہ اس منافق نے جنگ بدر کے موقع پر حضرت عباس رضی اللہ عنہ (عم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم) کو ایک کرتہ پہنایا تھا۔ آپ ﷺ نے اس کی مکافات میں مرنے کے بعد اسے کرتہ پہنا دیا (بلکہ مع شے زائد)(۱) یہ سب توجیہات شراح نے کی ہیں مگر ان باتوں سے ہم کو شفا نہیں ہوئی ہمیں تو اپنے استاد علیہ الرحمۃ کی بات پسند آئی کہ حضور ﷺ نے اس منافق کے ساتھ یہ معاملہ اس لیے فرمایا تاکہ امت کو یہ ضروری مسئلہ بتلا دیں کہ اگر کسی میں ایمان نہ ہو تو پھر چاہے اس کے پاس لاکھ تبرکات ہوں اور چاہے رسول ﷺ جیسا شخص اس کے جنازہ کی نماز بھی پڑھ دے اور رسول ﷺ ہی کا قمیص اس کا کفن ہو جائے اور حضور ﷺ کا لعاب مبارک اس کے منہ میں پڑ جائے جب بھی نجات نہیں ہو سکتی۔ اس لیے تنہا ان تبرکات کے بھروسہ پر کوئی نہ رہے چنانچہ عبداللہ بن ابی کے پاس اصل سرمایہ ایمان کا نہ تھا۔ اس لیے اس کے بارے میں کہا گیا۔ إِنَّ الْمُنَافِقِينَ فِي الدَّرْكِ الأَسْفَلِ مِنَ النَّارِ (۲) کہ منافقین جہنم کے سب سے نیچے کے طبقہ میں ہیں جس کا عذاب سب سے زیادہ سخت ہے۔

نسبت کا اثر

تو اب معلوم ہو گیا کہ بعض لوگوں کا یہ کہنا کہ ہم فلاں بزرگ کی اولاد یا سلسلہ میں ہیں اور ہمارے بزرگوں نے اللہ تعالیٰ سے یہ عہد کرلیا تھا کہ ہماری اولاد میں سے یا اتباع (۳) میں سے کوئی دوزخ میں نہ جائے، کیا کارآمد ہو سکتا ہے جب تک اپنے پاس کچھ سرمایہ نہ ہو۔ حضور ﷺ پر جب یہ آیت نازل ہوئی۔ وَأَنْذِرْ عَشِيرَتَكَ الْأَقْرَبِينَ (۴) تو حضور ﷺ نے اپنے سب خاندان کو جمع کیا اور سب کے ساتھ صاحبزادی صاحبہ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کو خطاب کرکے فرمایا۔ (يا فاطمة بنت محمد انقذى نفسك من النار لا اغنى عنك من الله شيئا)(۵) اور اپنی پھوپھی صاحبہ کو خطاب کرکے

(۱) بلکہ اس سے زیادہ ہی بدلہ دیدیا (۲) سورہ نساء: ۱۴۵ (۳) پیروکاروں میں سے (۴) ''اور اپنے رشتہ داروں کو آتش دوزخ سے ڈرایئے (۵) ''اے فاطمہ رضی اللہ عنہا بنت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اپنے نفس کو آتش دوزخ سے رہا کر میں تجھ کو کسی چیز سے اللہ تعالیٰ سے بے پرواہ نہیں کرسکتا'' سنن الترمذی: ۳۱۸۵

فرمایا: یا صفیة عمة رسول اللّٰہ انقذی نفسك من النار لا اغنی عنك من اللّٰہ شیئًا(۱) اسی طرح سب اعزہ سے فرمایا کہ اپنے آپ کو جہنم سے بچالو۔ میں تمہارے کام نہ آسکوں گا۔ یعنی اگر نرے میرے بھروسہ پر رہو گے، تو اس صورت میں میں کچھ کام نہ آؤں گا۔ ہاں خود بھی کچھ سرمایہ جمع کرلو تو بے شک آپ ﷺ کام آئیں گے۔

بس یہ درجہ ہے انتساب (۲) اور تبرکات کا کہ وہ بدون اپنے عمل کے تنہا کافی نہیں ہوتے۔ باقی اپنے پاس کچھ عمل ہو تو پھر وہ ضرور نافع ہیں۔ ان کی برکت کا انکار نہیں ہوسکتا۔ اگر تبرکات نافع نہ ہوتے تو سلف صالحین اس کا اہتمام نہ کرتے۔ حالانکہ سلف سے اس کا اہتمام منقول ہے۔ خود حضور ﷺ نے تبرکات دیئے ہیں۔ ایک مرتبہ حضور ﷺ نے اپنا چادرہ مبارک ایک صحابی کو عطا فرمایا اور حج کے موقع پر اپنے بال تقسیم فرمائے اور بعض واقعات سے ثابت ہوتا ہے کہ تبرکات واقعی کام بھی آتے ہیں مگر نرے تبرکات کام نہیں آتے۔ بلکہ اصل سرمایہ کے ساتھ یہ بھی مل جائیں تو نفع بڑھ جاتا ہے۔ اس کی تو ایسی مثال ہے جیسے کھانے کے ساتھ چٹنی اور مربا کہ اس سے کھانے کا لطف بڑھ جاتا ہے۔ اب اگر کوئی شخص دوستوں کی دعوت کرے اور سارا دسترخوان چٹنی اور مربا ہی سے بھر دے تو کیا یہ دعوت ہوگی۔ یہ تو مسخراپن ہوگا۔

اسی طرح جو چیزیں زوائد میں سے ہیں وہ سب ایسی ہیں کہ ان پر حصول مقصود موقوف نہیں ہوتا اور وہ تنہا مقصود سے مغنی نہیں ہوتیں (۳)۔ ہاں ضروریات کے ساتھ جمع ہوجائیں تو مفید ہوتی ہیں۔ دیکھو اگر دسترخوان پر چٹنی مربے نہ ہوں تو وہ دعوت ضرور ہے اور اگر چٹنی مربا ہی ہو کھانا نہ ہو تو اسے دعوت نہیں کہہ سکتے اور دونوں جمع ہوجائیں تو اعلیٰ درجہ کی اور لذیذ دعوت ہوگی۔

نفع تبرکات کی صورت

اسی طرح تبرکات نافع (۴) ضرور ہیں مگر ان کی نافعیت کے لیے کچھ شرطیں

(۱) ''اے صفیہ رضی اللہ عنہا پھوپھی رسول اکرم ﷺ اپنے نفس کو اعمال صالحہ کرکے دوزخ سے بچا میں کسی چیز سے تجھ کو اللہ تعالیٰ سے بے پرواہ نہیں کرسکتا'' الصحیح للبخاری: ۴/۸، ۶/۱۴۰ (۲) نسبت کا (۳) تنہا نسبت مقصود سے بے نیاز کرنے والی نہیں ہیں (۴) مفید

ہیں (یعنی ایمان وعمل صالح) جیسے گورنمنٹ اپنے وفاداروں کی رعایت کرتی ہے بشرطیکہ وہ بغاوت واقدام جرائم نہ کریں بلکہ تعلیم وتہذیب سے آراستہ ہوکر گورنمنٹ کی اطاعت بھی کریں تو ان کا خیال دوسروں سے زیادہ کیا جاتا ہے اسی لیے سلف نے بزرگوں کی نیک اولاد کا ہمیشہ احترام کیا ہے اور واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ بزرگ بھی اپنی اولاد کا خیال رکھتے ہیں۔ میری ایک رشتہ کی پھوپھی تھیں جو بچیوں کو پڑھایا کرتی تھیں۔ ہمارے ہاں یہ رسم ہے کہ لڑکیاں گھروں ہی میں تعلیم پاتی ہیں۔ ان کے لیے کوئی زنانہ سکول نہیں اور نہ یہ مناسب ہے (اس میں بہت مفاسد ہیں جن کا تجربہ رات دن ہوتا جاتا ہے) تو اسی طرح میری پھوپھی صاحبہ اپنے گھر پر لڑکیوں کو پڑھاتی تھیں اور کسی سے معاوضہ وغیرہ کچھ نہ لیتی تھیں۔ ایک مرتبہ ان کے یہاں ایک سید کی لڑکی پڑھنے آئی۔ وہ فرماتی تھیں کہ اسی روز رات کو میں نے حضرت فاطمہ زہرہ رضی اللہ عنہا کو خواب میں دیکھا فرماتی تھیں کہ عمدۃ النساء! دیکھو ذرا میری بچی کو محبت سے پڑھانا۔ اسی طرح اور بہت سی بشارتیں اور منامات ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ اہل اللہ کو اپنی اولاد کا خیال رہتا ہے اور آخرت میں اس نسبت سے یہ نفع ہوگا کہ حق تعالیٰ بزرگوں کی اولاد کو انہی بزرگوں کے درجوں میں پہنچادیں گے۔ چنانچہ ارشاد ہے: وَالَّذِينَ آمَنُوا وَاتَّبَعَتْهُمْ ذُرِّيَّتُهُم بِإِيمَانٍ أَلْحَقْنَا بِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ وَمَا أَلَتْنَاهُم مِّنْ عَمَلِهِم مِّن شَيْءٍ (۱) اس میں افراط وتفریط (۲) دونوں کا علاج کردیا گیا فرماتے ہیں کہ جو لوگ ایمان لائے اور ان کی اولاد ایمان کے ساتھ ان کی پیروی کرتی رہے یعنی کافر وشریر نہ ہو تو ہم ان کو بھی ان ہی کے ساتھ ملادیں گے۔ یعنی گو عمل میں دونوں برابر نہ ہوں مگر پھر بھی سب کو برابر کردیا جائے گا۔ جیسے کوئی بادشاہ کہیں مہمان بن کر جائے اور اس کا بیٹا بھی اس کے ہمراہ ہو تو وہ بھی اسی جگہ ٹھہرے گا جہاں بادشاہ ٹھہرے گا۔ اب یہاں کسی کو شبہ ہوسکتا تھا کہ شاید اس برابری کی صورت یہ ہو کہ اوپر کے درجہ والوں کو نیچے کردیا جائے

(۱) ''جو لوگ ایمان لائے اور ان کی اولاد ایمان کے ساتھ ان کی پیروی کرتی رہی تو ہم ان کی اولاد کو ان کے ساتھ ملادیں گے اور بلند درجہ والوں کے درجہ میں ذرہ برابر کمی نہ ہونے دیں گے'' سورہ الطور: ۲۱ (۲) کمی بیشی

یا کچھ ان کو گھٹایا جائے اور کچھ ان کو بڑھایا جائے اور اوسط پورا کر کے درمیانی درجہ دے دیا جائے تو اس کا جواب دیتے ہیں۔ وَمَآ اَلَتْنٰهُمْ مِّنْ عَمَلِهِمْ مِّنْ شَيْءٍ (۱) بس معلوم ہوگیا کہ برابری کی صورت یہ ہوگی یہ ناقص الاعمال کو کامل الاعمال کے درجہ میں بھیج دیا جائے گا کاملین کے درجات میں کمی نہ کی جائے گی۔ اب اس کو سن کر شاید کسی کو ہوس ہوتی کہ پھر ہم کو عمل کی کیا ضرورت ہے تو آگے ایسا فیصلہ فرمایا ہے جس سے اس خیال کا استیصال (۲) ہوگیا فرماتے ہیں۔ كُلُّ امْرِئٍ بِمَا كَسَبَ رَهِينٌ (۳) کہ ہر شخص اپنے کئے ہوئے (اعمال) کے ساتھ مقید ہوگا معلوم ہوا کہ عمل کی پھر بھی ضرورت ہے بدون عمل کے یہ دولت نصیب نہیں ہوسکتی۔

شرف نسب کی حیثیت

یہاں سے یہ مسئلہ حل ہوگیا کہ شرف نسب نافع ہے یا نہیں (۴)۔ اس وقت اس بارے میں غلو ہو رہا ہے بعض تو اسی کو اصل قرار دیتے ہیں اور بعض اس کو مٹاتے ہیں کہ یہ کوئی چیز نہیں اور دیکھا یہ گیا ہے کہ جو لوگ ذی نسب (۵) نہیں ہیں وہی زیادہ تر اس کو مٹاتے ہیں اور دونوں کا منشاء تکبر ہے۔ جو لوگ نسبت کو اصل قرار دیتے ہیں وہ بھی بڑا بننا چاہتے ہیں کہ ہمارے پاس اتنی بڑی چیز ہے ہم کو بڑا سمجھو اور جو اس کو مٹاتے ہیں وہ بھی بڑا بننا چاہتے ہیں کہ ہم شرفاء میں سے کسی بات میں کم نہیں ہیں۔ کیونکہ شرافت نسب کوئی چیز نہیں بعض نے تو یہ کیا کہ نسبت ہی کا استیصال کر دیا اور بعض نے یہ کیا کہ اپنے کو کھینچ تان کر شرفاء میں داخل کر دیا۔ میں ایک مقام پر گیا، وہاں کی چھوٹی قوموں نے اپنی چار قسمیں کر لیں۔ شیخ سید مغل پٹھان اور اپنے محلہ کا نام بھی بدل دیا میں اس جگہ کا نام نہیں لینا چاہتا جب میں وہاں گیا تو مجھ سے بیان کی درخواست کی گئی تو اتفاقاً میں نے نسب ہی کا بیان کیا (حالانکہ مجھے اس واقعہ کی اطلاع نہ تھی نہ کسی نے مجھ سے کچھ کہا تھا) تو وہ لوگ بہت ناراض ہوئے جنہوں نے اپنے کو شرفاء میں داخل کیا تھا اور کہنے لگے کہ بھلا یہی مضمون بیان کے لیے رہ گئے تھے۔ وہ یہ سمجھے کہ وہاں کے شیخ زادوں

(۱) ”ہم بلند درجہ والوں کے اعمال میں سے کچھ بھی کم نہ کریں گے“ (۲) اس خیال کو جڑ سے اکھاڑ پھینکا (۳) سورہ الطور: ۲۱ (۴) نسبی تعلق کا فائدہ ہوگا کہ نہیں (۵) عالی نسب

نے یہ مضمون فرمائش کر کے بیان کرایا ہے۔ اس لیے وہ شیخ زادوں سے بھی بہت خفا ہوئے (حالانکہ میری یہ بالکل عادت نہیں کہ فرمائشی مضمون بیان کروں۔ بس وقت پر جو بات دل میں آجاتی ہے بیان کر دیتا ہوں)۔

غرض نسبت کے بارے میں یہ غلو ہو رہا ہے اور منشاء اس کا محض تکبر ہے۔ جنہیں قدرت ہوتی ہے انکا تکبر زیادہ ظاہر ہوتا ہے اور جن کو قدرت نہیں ان کے بھی برتاؤ سے پتہ چل جاتا ہے کہ یہ اپنے کو بڑا بنانا چاہتے ہیں۔

حضرت تھانوی کا حکیمانہ جواب

چنانچہ میں ایک قصبہ میں جس کا نام کاندھلہ ہے گیا ہوا تھا۔ وہاں ایک نائی نے مجھ سے مسئلہ پوچھا کہ جو شخص السلام علیکم کہنے سے چڑے وہ کیسا ہے؟ یہ سوال اس نے بھرے مجمع میں کیا تھا جہاں وہ رؤسا بھی موجود تھے جو اس شخص کے زعم میں السلام علیکم سے چڑتے تھے۔ وہ بڑے متفکر ہوئے کہ دیکھئے کیا فتویٰ لگتا ہے میں نے کہا کہ جو السلام علیکم سے چڑے وہ بہت برا اور جو السلام علیکم مساوات اور برابری جتلانے کے لیے تان کر اور لٹھ سا مار دے وہ اس سے بھی برا، چھوٹا آدمی بڑوں کو سلام کرے تو اس کا طریقہ یہ ہے کہ چھوٹا بن کر نرمی سے السلام علیکم کہے لٹھ سا نہ مار دے۔ بس اس طرح کہیے جیسے بیٹا باپ کو السلام علیکم کہا کرتا ہے۔ اس سے کوئی نہ چڑے گا نہ کسی کو ناگواری ہوگی پس کہو السلام علیکم ہی مگر اس طرح کہو۔ جب سائل چلا گیا تو سارے رؤسا ہنسنے لگے اور کہا کہ صاحب بس تم نے اس مرض کو سمجھا واقعی یہ جب سلام کرتا ہے لٹھ سا مارتا ہے جیسے کوئی برابری جتلاتا ہو۔ اسی سے ہم کو ناگواری ہوتی ہے۔ ورنہ آدمیت سے سلام کرے تو کون چڑتا ہے۔ غرض شرفاء کو تو متکبر کہا ہی جاتا ہے مگر یہ غریب بھی کچھ کم نہیں ہوتے۔

''السلام علیکم'' کہنا مسنون ہے

ایک قصہ اس کے مقابل مجھ کو یاد آگیا کہ ایک نائی کسی کا خط لے کر ایک قصبہ میں گیا وہاں جا کر اس نے السلام علیکم کہا تو شیخ زادوں نے اسے خوب پیٹا۔ اس نے پوچھا کہ حضور پھر کیا کہوں؟ لوگوں نے کہا کہ حضرت سلامت کہا کرو۔ اس کے بعد نماز

جمعہ کا وقت آیا تو جب امام نے السلام علیکم ورحمۃ اللہ کہا تو اس نائی نے پکار کر کہا۔ حضرت سلامت ورحمۃ اللہ حضرت سلامت ورحمۃ اللہ۔ امام نے اس کو بلا کر پوچھا کہ یہ کیا حرکت ہے اس نے کہا کہ حضرت میرا قصہ سن لیجئے۔ بات یہ ہے کہ میں نے یہاں کے رئیسوں کو السلام علیکم کہہ کر سلام کیا تھا تو انہوں نے مجھے بہت مارا اور یہ کہا کہ حضرت سلامت کہنا چاہئے۔ مجھے ڈر ہوا کہ اگر کہیں فرشتے بھی السلام علیکم سے خفا ہو گئے تو ان میں ایک فرشتہ ملک الموت بھی ہے وہ تو میری جان ہی نکال لیں گے۔ اس لیے میں نے نماز میں بھی حضرت سلامت ہی کہا۔ اس پر امام صاحب نے وعظ میں ان رئیسوں کی خبر لی کہ یہ کیا واہیات ہے تم لوگوں کو طریق سنت سے منع کرتے ہو۔ سو کچھ لوگ ایسے بھی ہیں۔

حضرت تھانویؒ کا جواب لاجواب

ایک اور قصہ یاد آیا، کانپور میں ایک دفعہ میرے پاس دیہات کے ایک قاضی صاحب تشریف لائے اور السلام علیکم کہہ کر بیٹھ گئے۔ تھوڑی دیر میں کہنے لگے کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں۔ میں نے کہا فرمایئے کہنے لگے کہ اس عملداری میں شرفاء اور غرباء میں بالکل مساوات ہوگئی (۱) البتہ صرف ایک فرق السلام علیکم کا رہ گیا تھا ہمارے مولویوں نے یہ بھی اٹھا دیا سب کے لیے وہی السلام علیکم۔ میں نے کہا قاضی صاحب شرفا اور غرباء میں جو فرق ہے تو یہ دینی امور میں ہے یا دنیوی امور میں۔ اگر دینی امور میں ہے تو جا کر اپنے شہر میں غرباء سے کہہ دیجئے کہ ظہر وعصر وعشاء کی تین رکعت پڑھا کرو (اور مغرب کی دو اور صبح کی ایک) اور اگر وہ نہ مانیں تو تم چار کی پانچ اور تین کی چار اور دو کی تین پڑھا کرو تا کہ برابری نہ ہو جاوے۔ وہ بہت ہی چپ ہوئے۔ پھر میں نے کہا کہ اب بتلایئے کہ السلام علیکم دین کا کام ہے یا دنیا کا۔ ظاہر ہے کہ دین کا کام ہے، پھر اس میں امیر وغریب کا فرق کیوں ہو، باقی دنیوی امور میں فرق کرنے سے ہم منع نہیں کرتے، یہی فرق بہت ہے کہ تم سرہانے بیٹھے ہو اور غرباء پائنتی پر بیٹھے ہیں (اگر کوئی غریب آدمی امیر کے برابر سرہانے چڑھ کر بیٹھے گا تو ہم اس کو ضرور منع کریں گے)

(۱) برابری

انتساب کے بارے میں قول فیصل

غرض نسبت کے باب میں جانبین سے یہ غلو ہورہا ہے کہ بعض نے اسی کو اصل قرار دے لیا ہے اور بعض کہتے ہیں کہ یہ بالکل کوئی چیز نہیں۔ اس لیے میں اس کا فیصلہ کرتا ہوں جو اسی آیت کے مضمون سے اور اسی مقام سے مستنبط ہوتا ہے۔ میں پوچھتا ہوں کہ اس وقت جو لوگ شریف ہیں اور اپنے کو صدیقی یا فاروقی یا سید کہتے ہیں تو وہ بتلائیں کہ ان کے اسلاف میں شرف کہاں سے آیا۔ ظاہر ہے کہ یہ حضرات منتسب الیہم (۱) چونکہ دین میں کامل تھے۔ اس لیے ان کی طرف انتساب سبب شرف ہوگیا تو اصل وجہ شرف دین وایمان ٹھہرا، یہی سبب ہے ہمارے اسلاف کے شرف کا اور اسی وجہ سے ان کی طرف انتساب بھی سبب شرف ہوگیا ۔ یہ ضرور ہے کہ اس کے ساتھ وہ حضرات عالی خاندان بھی تھے مگر تنہا یہی سبب شرف نہیں (کیونکہ عالی خاندان تو ابوجہل وابولہب بھی تھے مگر ان کی طرف انتساب کسی کو بھی گوارا نہیں) بلکہ اس کے ساتھ چونکہ ان حضرات کا کمال دین بھی مل گیا ہے اس لیے انتساب میں شرف آ گیا۔ تو یہ بالکل بے اصل چیز نہیں ہے بلکہ شریعت نے اس شرف کا اعتبار کیا ہے دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی۔

چنانچہ دنیا میں تو اس طرح اعتبار کیا گیا ہے کہ حدیث میں حکم ہے کہ نکاح اکفاء (۲) میں کیا کرو اور شریعت نے کسی شریف زادی کو کفو غیر شریف کو نہیں مانا اور آخرت میں بھی اتنا نفع ہے کہ جو شخص ان شرفاء کی اولاد میں ہوگا وہ اگر ایمان وعمل صالح اختیار کرے تو اس کو دوسروں سے کچھ زیادہ ملے گا اور جنت میں وہ اپنے اسلاف (۳) کے درجہ میں ہوگا گو اعمال اس درجہ کے نہ ہوں۔ لیکن یہ نفع کچھ عرفی شرفاء (۴) کے ہی ساتھ مخصوص نہیں بلکہ اگر کوئی جولاہا بھی ولی ہو تو اس کے بیٹے کو بھی وہی نفع حاصل ہوگا جو ان شرفاء کے بیٹوں کو ہوگا غرض شرافت میں آخرت کا بھی نفع ہے مگر اصطلاحی شریف کے

(۱) وہ حضرات جن کی طرف آپ اپنے کو منسوب کرتے ہیں (۲) بچیوں کا نکاح اپنے کف میں کرو۔ یعنی اپنے برابر کے لوگوں میں برابری ان باتوں میں ہونی چاہیے۔ ۱۔ نسب میں ۔ ۲۔ مسلمان ہونے میں ۔ ۳۔ دینداری میں ۔ ۴۔ مال میں ۔ ۵۔ پیشہ میں۔ تفصیل کے لیے دیکھئے بہشتی زیور حصہ ۴ ص ۱۰ (۳) بزرگوں کے (۴) جن کو عرف میں شریف کہتے ہیں

ساتھ خاص نہیں بلکہ جو بھی مقبول عنداللہ ہوگا اس کی طرف انتساب نافع ہوگا(۱)۔

پس یہ کہنا غلط ہے کہ شرف نسب نافع نہیں۔ نافع ضرور ہے مگر وہ شرف انتسابی کے ساتھ خاص نہیں بلکہ جو شریف عنداللہ ہو اس کی طرف انتساب نافع ہے خواہ وہ تمہاری اصطلاح کے موافق شریف ہوں یا نہ ہوں۔ پس آخرت میں تو شریف اور غیر شریف میں اس طرح تفاوت ہوگا باقی دنیا میں تو تفاوت ہے ہی کہ غیر شریف کو شریف زادی کا کفو نہیں مانا گیا (نیز عقل وفہم، تہذیب واخلاق وغیرہ میں بھی شریف وغیر شریف کا تفاوت ظاہر ہوجاتا ہے)۔ مگر اس کا یہ اثر نہ ہونا چاہئے کہ تم دوسروں کو ذلیل سمجھو۔ بس ایسا تفاوت سمجھنا چاہئے جیسے چھوٹے بھائی اور بڑے بھائی یا باپ اور بیٹے میں اور حاکم ومحکوم میں ہوا کرتا ہے۔ اس تفاوت کا یہ اثر نہیں ہوا کرتا کہ بڑا بھائی چھوٹے کو یا باپ بیٹے کو حقیر سمجھنے لگے۔ یہ فیصلہ ہوا اس اختلاف کا۔

ایمان وعمل صالح کا اہتمام

یہ تو جملہ معترضہ تھا اصل میں میں یہ ذکر کررہا تھا کہ نرا انتساب کافی نہیں بلکہ اس کے ساتھ ایمان وعمل صالح بھی ضروری ہے۔ چنانچہ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَاتَّبَعَتْهُمْ ذُرِّيَّتُهُمْ بِاِيْمَانٍ (۲) سے یہ مضمون صاف طور سے نکل آیا، پس اب کسی کو اس پر قناعت نہ کرنا چاہئے کہ ہم بزرگوں کی اولاد یا سلسلہ میں ہیں یا ہمارے پاس ان کے تبرکات ہیں بلکہ ایمان وعمل کا اہتمام کرنا چاہئے اس کے ساتھ اس انتساب کی برکت بھی کام دے گی ورنہ بے کار ہے۔ یہی مضمون اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سَيَجْعَلُ لَهُمُ الرَّحْمٰنُ وُدًّا (۳) سے بھی مستفاد (۴) ہوتا ہے کیونکہ اس میں مقبولیت کا مدار ایمان وعمل صالح ہی کو ٹھہرایا گیا ہے۔ معلوم ہوا کہ ان کے سوا اور کوئی شے مدار کار نہیں بلکہ زوائد کی قبیل سے ہیں۔ بہرحال مقصود ومقام یہ ہے کہ اس آیت کے اول جزو میں طریق حصول مقصود مذکور ہیں۔ اور اس کی فہرست بتلائی گئی ہے جس کے دو جزو ہیں۔

(۱) اس کی نسبت کا فائدہ ہوگا (۲) ''جو لوگ ایمان لائے اور ان کی اولاد نے ایمان میں ان کا اتباع کیا'' سورۃ الطور:۲۱ (۳) ''بے شک جو لوگ ایمان لائے اور نیک کام کریں اللہ تعالیٰ ان کے لیے محبوبیت پیدا کردیں گے'' سورہ مریم:۹۶ (۴) نکلتا ہے

ایک ایمان ایک عمل صالح اور اس وقت میں اسی طریق کی تفصیل کرنا چاہتا ہوں سو ایمان کی تفصیل کے لیے تو باب العقائد دیکھنے کی ضرورت ہے۔ اگر میں تمام عقائد کی تفصیل کروں تو اس کے لیے ایک جلسہ ناکافی ہے اس لیے میں اس وقت پوری تفصیل تو ذکر کرنا نہیں چاہتا صرف اقسام اولیہ ذکر کرنا چاہتا ہوں جن میں آج کل لوگوں نے غلطی کر رکھی ہے۔

عقائد کی غلطیاں

تو سمجھئے کہ آج کل لوگوں کو عقائد کے باب میں دو قسم کی غلطیاں واقع ہو رہی ہیں۔ ایک تو وہ لوگ ہیں جو عقائد کو ضروری سمجھتے ہیں مگر ضرورت کو اسی میں منحصر کرتے ہیں یعنی اعمال کی ضرورت نہیں سمجھتے چنانچہ عام طور سے یہ عقیدہ ہے کہ جو توحید و رسالت کا قائل ہو اور لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ کا معتقد ہو بس وہ جنتی ہے اب اسے کسی عمل کی ضرورت نہیں۔ پھر بعض نے اور انتخاب کیا ہے کہ ایمان کا بھی اختصار کر لیا کیونکہ ایمان کی حقیقت تو یہ ہے التصدیق بما جاء به النبی صلی اللّٰہ علیه وسلم ان تمام باتوں کی تصدیق کرنا جن کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم لائے ہیں۔

یعنی حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جو جو خبریں دی ہیں کہ اللہ واحد ہے، قیامت آنے والی ہے، وزن حق ہے، حساب کتاب حق ہے، دوزخ جنت حق ہے، تقدیر کا مسئلہ حق ہے، فرشتوں کا وجود حق ہے، پل صراط پر چلنا حق ہے نماز کی فرضیت حق ہے، زکوٰۃ اور روزہ وحج سب کی فرضیت حق ہے، کیونکہ یہ طاعات گو اعمال ہیں مگر ان کی فرضیت کا اقرار کرنا ایمان میں داخل ہے یعنی ایک تو نماز کا پڑھنا ہے اور روزہ رکھنا زکوٰۃ دینا حج کرنا یہ تو عمل ہے اور ایک ان کی فرضیت کا اعتقاد رکھنا یہ ایمان کا جزو ہے۔ بدون اس اعتقاد فرضیت کے ایمان کا تحقق نہیں ہوسکتا، تو ایمان نام تھا ان سب چیزوں کی تصدیق کا مگر آج کل لوگوں نے اس میں بھی انتخاب کر لیا ہے، بعضے وزن اعمال کو ضروری نہیں سمجھتے، بعضے پل صراط کی تصدیق کو ایمان میں داخل نہیں سمجھتے، کوئی تقدیر کے مسئلے کا انکار کرتا ہے وعلیٰ ہذا۔ اور پھر بھی وہ اپنے کو مسلمان سمجھتے ہیں۔

تھوڑے دنوں پہلے یہ حالت تھی کہ ان عقائد میں کسی کو اختلاف نہ تھا گو فروع میں اختلاف تھا کیونکہ اختلاف کی دو قسمیں ہیں، ایک تو ایسے امور میں اختلاف جن میں

اختلاف کی گنجائش ہے۔ یہ تو فروع ظنیہ میں ہوتا ہے جیسا کہ مجتہدین میں اختلاف ہوا ہے یا ان کے بعد ان کے اتباع میں ہوا ہے(۱)۔ یہ تو سب اعمال کے درجہ میں اختلاف ہے، عقائد میں کسی کو اختلاف نہ تھا، اور اگر عقائد میں بھی کسی نے اختلاف کیا ہے تو وہ عقائد مہمہ مقصودہ میں نہ تھا بلکہ عقائد مہمہ کی فروع میں تھا۔ مگر کچھ دنوں سے ایک ایسا اختلاف پیدا ہوا ہے جس کے ذکر کرنے کو بھی جی نہیں چاہتا یعنی اب ان امور میں بھی اختلاف ہونے لگا ہے جن میں کچھ دن پہلے کسی کو شبہ بھی نہ تھا مگر اس وقت اس نئی تعلیم کی بدولت بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ علم دین نہ ہونے یا دین سے محبت اور علماء کی صحبت نہ ہونے کی بدولت عقائد مہمہ (۱) میں بھی اختلاف ہونے لگا ہے۔

خرابی کی وجہ

ہمارے بزرگوں میں گو علم دین تو عام طور پر کامل نہ ہوتا تھا عالم دو چار دس پانچ ہی ہوتے تھے مگر یہ دو چیزیں ان کے پاس بڑی کام کی تھیں یعنی دین کی محبت اور علماء کی صحبت مگر اس وقت ہمارے بھائیوں نے علم دین کو چھوڑا ہی تھا ساتھ میں ان دونوں کو بھی چھوڑ دیا اور یہی وجہ ہے ہماری خرابیوں کی۔ کیونکہ جو شخص طبیب کے پاس نہ جائے گا اس کو صحت نہیں ہوسکتی اور طبیب کے پاس وہ جائے گا جس کو صحت مطلوب ہو، تو آج کل ہمارے بھائیوں کو دراصل دین ہی سے محبت نہیں، اس لیے اطباء دین کے پاس نہیں جاتے، اسی لیے ان کے ایمان ودین کو قسم قسم کے روگ لگ جاتے ہیں جن کی ان کو خبر بھی نہیں ہوتی اور سب سے بڑی بیماری یہ ہے کہ بیمار کو بیماری کی اطلاع بھی نہ ہو اور اس سے سخت یہ ہے کہ وہ تندرستوں کو بیمار سمجھنے لگے، جیسے ایک نکٹا ناک والوں کو نکّو کہتا تھا یہی حالت ہمارے بھائیوں کی ہے کہ وہ پرانے لوگوں کو جو ایمان میں کامل ہیں تندرست تو کیا سمجھتے ان کے لیے ایسے ایسے لقب تجویز کرتے ہیں کہ وہ اپنے جواب ہی کی فکر میں پڑ جاویں۔ عجیب الٹا زمانہ آ گیا ہے۔

صاحبو! پرانے لوگوں میں بھی گنہگار تو ہیں فاسق بھی ہیں مگر ان کی حالت یہ ہے کہ اہل علم کے سامنے جھک جاتے ہیں۔ اگر ان کو عذاب آخرت سے ڈرایا جائے تو

(۱) پیروکاروں میں ہوا (۲) اہم عقائد میں۔

ڈر جاتے ہیں۔ وہ اپنے کو اہل الرائے نہیں سمجھتے۔ اسی لیے ان کا ایمان سلامت ہے، باقی جہاں نئی تعلیم ہے اور نری تعلیم ہی تعلیم ہے وہاں تو ایمان کی خیر صلا ہے۔ نہ ان میں دین کی محبت ہے نہ اہل دین کی عظمت ہے، ہر شخص اپنے کو صاحب رائے سمجھتا ہے اور علماء سے مسائل دینیہ میں مزاحمت کرتا ہے باقی جہاں نئی تعلیم کے ساتھ یہ دونوں دولتیں بھی ہوں یعنی دین کی محبت اور اہل اللہ کی صحبت تو وہاں اس سے دین کا کچھ ضرر نہیں ہوتا بلکہ وہاں دنیا کے ساتھ دین بھی جمع ہوجاتا ہے۔ اسی محبت وعلم دین کی نسبت کہتے ہیں۔

دریں زمانہ رفیقے کہ خالی از خلل است صراحی مے ناب وسفینہ غزل است

اس زمانہ میں جو رفیق خلل سے خالی ہے وہ محبت الٰہی اور دین ہے۔

صراحی مے ناب سے محبت مراد ہے یہ ان کی خاص اصطلاح ہے اور سفینہ غزل سے علم دین مراد ہے۔ جس کا ایک طریق تو تعلم ہے۔ اگر یہ میسر نہ ہو تو صحبت اہل اللہ ہے۔

کتب بینی میں احتیاط

اگر یہ بھی نہ ہو تو دین کی کتابوں کا مطالعہ ہے۔ مگر کتاب کے لیے بھی صحبت کی ضرورت ہے نری کتب بینی سے دین کا صحیح علم حاصل نہیں ہوسکتا۔ جب تک کسی عالم سے سبقاً سبقاً نہ پڑھا جاوے خواہ وہ کتاب اردو زبان ہی میں کیوں نہ ہو۔ جیسے اردو میں طب کی کتابیں دیکھ کر کوئی شخص طبیب نہیں بن سکتا جب تک کسی طبیب کے پاس رہ کر نہ پڑھے۔

پھر اس زمانہ میں تو لوگ کتابیں بھی ایسی مختلف دیکھتے ہیں کہ خدا کی پناہ۔ بس جو کتاب سامنے آئی دیکھنے لگے چاہے اس کا مصنف محقق ہو یا غیر محقق۔ پھر مختلف لوگوں کی کتابیں دیکھ کر خود ہی فیصلہ بھی کرتے ہیں کہ فلاں شخص نے اس مسئلہ کو دوسرے سے اچھا لکھا ہے اور عضب یہ ہے کہ اپنے فیصلہ کو معتبر بھی سمجھتے ہیں۔ بھلا اگر کوئی ایسا شخص جو قانون گورنمنٹ سے ناواقف ہو کر کسی مقدمہ کا فیصلہ کرنے لگے تو کیا اس کا فیصلہ معتبر ہوگا؟ ہرگز نہیں۔ پھر حیرت ہے کہ جو شخص خدا کے قانون سے ناواقف ہے اس کے فیصلہ کو معتبر مانا جائے۔ اگر ایسا ہے تو پھر وکلاء اور بیرسٹروں کی کیا حاجت ہے۔ بس ہر شخص قانون کو دیکھ کر فیصلہ کرلیا کرے۔ مگر سب یہاں اس پر متفق ہیں کہ قانون سلطنت کا

سمجھنا ہر اک کا کام نہیں بلکہ جس نے اس کو باقاعدہ پڑھا ہو اور اس میں امتحان دے کر پاس ہوگیا ہو اسی کی رائے معتبر ہے۔ مگر حیرت ہے کہ قانون الٰہی کے سمجھنے کے لیے کسی امتحان اور پاس کی ضرورت نہیں بلکہ ہر شخص اس میں رائے زنی کرنے کے لیے تیار ہے اردو کی کتابیں دیکھ کر فیصلہ کرنے کو آمادہ ہے اور فیصلہ بھی کیسے صحیح اصول پر مبنی کہ جو سمجھ میں نہیں آیا اس کی نفی کردی۔ بس ہمارے بھائیوں نے یہی ایک سبق یاد کرلیا ہے جیسے ایک استاد نے اپنے ایک بے وقوف شاگرد کو سکھلا دیا تھا کہ جو مسئلہ تجھ سے پوچھا جاوے اگر معلوم ہو تو بتلا دیا اور جو معلوم نہ ہوا تو یہ کہہ دیا کہ اس میں اختلاف ہے (اس سے جہالت کا عیب چھپا رہے گا۔ لوگ سمجھیں گے کہ ان کو معلوم تو ہے مگر اختلاف کی وجہ سے ایک شق کو معین نہیں کرتے اور مختلف فیہ مسائل بکثرت ہیں۔ اس لیے اکثر مواقع میں یہ جواب صحیح ہوگا۔ مگر وہ بے وقوف تو تھا ہی اس نے بعض متفق علیہ مسائل میں بھی کہہ دیا کہ اس میں اختلاف ہے بالآخر اس کی حماقت ظاہر ہو کر رہی)۔

خودرائی کا مرض

اس طرح ہمارے بھائیوں نے ایک سبق پڑھ لیا ہے کہ جو بات ان کی سمجھ میں نہ آئی کہہ دیا کہ یہ عقل کے خلاف ہے اس لیے قابل قبول نہیں۔ اور لگے نصوص میں تحریف وتاویل (۱) کرنے۔ چنانچہ ان کے نزدیک پلصراط بھی خلاف عقل ہے اور ساری معادیات اور معجزات (۱) خلاف عقل ہیں۔ تو اس طرح انہوں نے عقائد میں بھی اختصار وانتخاب کرنا شروع کیا۔ (اب ایمان کے معنی وہ نہ رہے جو پہلے تھے یعنی تصدیق بما جاء بہ النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم۔ بلکہ یہ معنی ہوں گے کہ تصدیق بما وافق العقل مما جاء به النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم یعنی ان کے نزدیک ایمان کہتے ہیں اس چیز کے ماننے کو جو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بیان کردہ باتوں میں سے ان کی عقل کے مطابق ہو) میں کہتا ہوں کہ یہاں دو مقدمے ہیں ایک یہ کہ جو بات شریعت میں عقل کے خلاف ہے تو وہ کس کی عقل کے خلاف ہے۔ تمہاری عقل کے یا سب عقلاء کی عقل کے۔ دوسری شق تو مسلم نہیں کیونکہ علماء راسخین جن کی عقل کے سامنے اہل دنیا کی عقل کچھ حقیقت نہیں رکھتی۔ ان کو خلاف عقل نہیں

(۱) قرآن وحدیث میں تحریف وتاویل شروع کردی (۲) آخرت کی تمام باتیں اور معجزات انبیاء خلاف عقل ہیں

کہتے اور ہر زمانہ میں ان مسائل کو اسی صورت پر تسلیم کرتے چلے آئے ہیں۔ اس صورت میں شریعت میں تعلیم دی گئی ہے چنانچہ حضرات صحابہ وتابعین وعلماء وصلحاء امت سب ان کا اعتقاد ظاہر کے مطابق رکھتے آئے ہیں۔ اگر یہ کہو کہ تمہاری عقل کے خلاف ہے تو اس صورت میں صغریٰ تو مسلم (۱) مگر یہ کبریٰ مسلم (۲) نہیں کہ جو تمہاری عقل کے خلاف ہو وہ غلط اور ناقابل قبول ہے۔ کیونکہ قوانین سلطنت میں بہت سی باتیں تمہاری عقل میں نہیں آئیں مگر تم قانون دانوں کی عقل پر اعتماد کر کے ان کو تسلیم کرتے ہو۔

ہماری عقل کا حال

اس کو بھی جانے دو، میں تم ہی سے پوچھتا ہوں کہ ماں کے پیٹ سے تم جس طرح پیدا ہوئے ہو کیا یہ تمہاری عقل میں آتا ہے۔ واللہ! ہم کو اس پر حیرت اس لیے نہیں ہوتی کہ رات دن اس کا مشاہدہ ہو رہا ہے اگر اس کا مشاہدہ نہ ہوتا اور صرف بیان سے یہ طریقہ معلوم ہوتا تو ہرگز عقل میں نہ آتا۔ اس کا امتحان اس طرح ہوسکتا ہے کہ تم ایک نوزائیدہ بچہ کی اس طرح نگرانی کرو کہ وہ یہ بات سننے یا دیکھنے نہ پائے کہ بچہ ماں کے پیٹ سے پیدا ہوا کرتا ہے۔ اس کے بعد آپ اس کو فلسفہ اور سائنس اور طب سب کچھ پڑھا دیں مگر یہ مسئلہ نہ پڑھائیں جس میں طریق ولادت کا ذکر ہو پھر جب وہ بی اے اور ایم اے اور ایل ایل بی ہو جائے اس وقت اس سے کہو کہ خبر بھی ہے تُو کیوں کر پیدا ہوا تھا اور اس سے بیان کرو کہ اول تیرا باپ تیری ماں کے پاس گیا تھا جس سے منی کے کچھ قطرے تیری ماں کے پیٹ کے اندر جو رحم ہے اس میں گرے تھے پھر رحم کے اندر اس کی پرورش ہوئی کہ خون بنا اور خون سے علقہ پھر مضغہ بنا۔ پھر گوشت میں ہڈیاں بنیں پھر جسم کامل تیار ہو گیا تو اس میں روح پڑی جس کی پرورش عرصہ تک خون رحم سے ہوتی رہی۔ پھر نو ماہ بعد تُو شرمگاہ مادر سے نکلا۔ اور اب وہی خون رحم دودھ کی شکل میں ماں کے پستان میں آ گیا اس سے دو برس تک پرورش پاتا رہا الی آخرہ۔ تو میں سچ کہتا ہوں کہ واللہ العظیم وہ نہایت سختی سے آپ کی مخالفت کرے گا اور کہے گا کہ ایک قطرہ سے ایسے حسین جسم کا بننا، پھر اس کا شرمگاہ سے جو نہایت تنگ راستہ ہے نکل آنا عقل کے بالکل

(۱) اس حد تک تو بات قابل تسلیم ہے (۲) مگر تم نے جو اس کا نتیجہ نکالا وہ درست نہیں

خلاف ہے۔ اب بتلایئے کہ اگر یہ قاعدہ مان لیا جائے کہ جو بات جس کی عقل میں نہ آئے وہ غلط ہوا کرے تو پھر آپ کا ماں کے پیٹ سے پیدا ہونا بھی غلط ہے۔ بات یہ ہے کہ آپ خلاف عادت کو خلاف عقل کہتے ہیں جیسے وہ نوزائدہ بچہ جس کی ایسی نگرانی کی گئی ہو جس کا اوپر ذکر ہوا ماں کے پیٹ سے پیدا ہونے کو خلاف عقل کہے گا کیونکہ اس نے یہ بات کبھی دیکھی یا سنی نہ تھی۔ اور آپ اس کو خلاف عقل اس لیے نہیں کہتے کہ آپ کو اس کی عادت ہوگئی۔ ورنہ آپ بھی وہی کہتے جو وہ کہتا اور ظاہر ہے کہ خلاف عقل کا وقوع نہیں ہوسکتا۔ تو معلوم ہوا کہ آپ خلاف عقل ایسی باتوں کو بھی کہتے ہیں جن کا وقوع مشاہدہ ہوجائے وہ خلاف عقل نہ رہیں۔

خلاف عادت اور خلاف عقل کا فرق

معلوم ہوا کہ آپ دراصل خلاف عادت کو خلاف عقل کہہ رہے ہیں اور کسی بات کو صحیح ہونے کے لیے خلاف عادت ہونا مضر نہیں اور نہ یہ غلط ہونے کی دلیل ہے۔ ورنہ پھر اس لڑکے کے قول کو بھی مان لینا چاہئے جو ماں کے پیٹ سے انسان کے پیدا ہونے کو غلط کہتا تھا اور نیز بہت سی باتوں کو جنہیں آپ چاردن پہلے مستبعد اور محال سمجھتے تھے اور آج ان کا مشاہدہ ہورہا ہے غلط کہنا چاہئے۔ (جیسے ریل کا ایک گھنٹے میں ساٹھ میل طے کرنا اور پانچ منٹ میں لندن سے تار کے ذریعہ سے خبر آجانا وغیرہ وغیرہ)(۱)

اس کے علاوہ دنیا میں بہت سے امور عادت کے خلاف ہوتے رہتے ہیں میں نے ایک مرغی کا بچہ دیکھا ہے جس کے چار پیر تھے (اور آج کل دہلی میں دولڑکیاں جڑی ہوئی نمائش میں آئی تھیں جن کے تمام اعضاء جدا جدا تھے مگر کمر جڑی ہوئی تھی اور پیشاب گاہ الگ الگ اور پیشاب نکلتا ایک رستہ سے تھا) تو بتلایئے کیا خلاف عادت کے لیے بھی کوئی ضابطہ ہوسکتا ہے جس کے اوپر بنا کر کے بعض امور کو مانا جائے کسی بات کے متعلق یہ کہا جائے کہ یہ خلاف عادت ہے کیونکہ عادت کا مقتضا تو یہ ہے کہ ہر شے اپنی اصلی حالت پر رہے جو معدوم ہے معدوم رہے اور جو موجود ہے وہ کبھی فنا نہ ہو مگر رات دن

(۱) آج کل بذریعہ موبائل ہزاروں میل دور کی آواز بلاواسطہ پہنچ جانا، ٹی وی پر تصاویر اور آوازوں کا منتقل ہوجانا۔ وغیرہ

اس کے خلاف مشاہدہ ہورہا ہے۔ ہزار ہا معدوم وجود میں آتے اور لاکھوں موجود معدوم ہوجاتے ہیں معلوم ہوا کہ کسی بات کا خلاف عادت ہونا اس کے غلط ہونے کو مستلزم نہیں (۱)

اب دوسرا مقدمہ یہ سن لیجئے کہ آپ خلاف عادت کو خلاف عقل کہتے ہیں اور ان دونوں میں فرق نہیں کرتے حالانکہ یہ بڑی سخت غلطی ہے۔ سنئے میں اس کا فرق بتلاتا ہوں۔ خلاف عادت تو وہ ہے جو عقلاً ممکن ہو مگر مشاہدہ نہ ہونے کی وجہ سے دشوار مستبعد معلوم ہوتا ہو (اور خلاف عقل وہ ہے جو عقلا ناممکن ہے یعنی عقل اس کے استحالہ پر دلیل قائم کرسکے اور استحالہ کہتے ہیں اجتماع نقیضین کو۔ تو خلاف عقل وہ ہے جس کے ماننے سے نقیضین کا ایک محل میں ایک آن میں ایک جہت سے مجتمع ہونا لازم آجائے)

محال عقلی پر غلط استدلال

اب جو لوگ معادیات (۲) کو اور پل صراط ووزن اعمال وغیرہ کو خلاف عقل کہتے ہیں وہ مہربانی کرکے ان کے استحالہ پر دلیل عقلی قائم کریں (اور بتلائیں کہ ان کے ماننے سے اجتماع نقیضین کیوں کر لازم آتا ہے) یقینا وہ ہرگز کوئی دلیل عقلی ان کے استحالہ (۳) پر نہیں قائم کرسکتے بس بہت سے بہت یہی کہیں گے کہ ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ کیونکر ہوجائے گا۔ اس کی نظیر دکھلاؤ۔ بس آج کل تمام شبہات کا حاصل یہ ہے کہ اس کی کوئی نظیر نہیں ملتی اس لیے یہ محال ہے اور جو دعویٰ امکان کا کرتا ہے وہ اس کی نظیر دکھلائے۔ عجب اندھیر ہے کہ نظیر پر ثبوت شے کو موقوف بتلایا جاتا ہے اور جس چیز کی نظیر نہ ملے اس کو خلاف عقل اور محال کہا جاتا ہے۔ لوگوں کو ثبوت کی حقیقت ہی معلوم نہیں نظیر پر ثبوت کو موقوف سمجھتے ہیں (میں کہتا ہوں کہ جو صنائع اور عجائبات اس زمانہ میں ایجاد یا مشاہد ہوئی ہیں کیا اس زمانہ سے پہلے کسی کے پاس ان کی نظیر تھی اور اگر نہ تھی تو کیا اسوقت یہ خلاف عقل اور محال تھیں۔ اور اگر محال تھیں تو پھر آج ان کا وقوع کیوں کر ہوا۔ معلوم ہوا کہ کسی شی کا امکان نظیر کے ملنے پر موقوف نہیں) تو خوب سمجھئے کہ کسی دعویٰ کا ثبوت نظیر کے ملنے پر موقوف نہیں بلکہ نظیر تو محض توضیح اور تنویر (۴) کے لیے ہوا کرتی

(۱) خلاف عادت ہونے کی وجہ سے اس کو غلط نہیں کہہ سکتے (۲) آخرت میں پیش آنے والے معاملات (۳) اس کے محال ہونے پر (۴) مثال تو صرف مسئلے کی وضاحت کے لیے کی جاتی ہے۔

ہے۔ مدعی ثبوت کے ذمہ نظیر کا پیش کرنا ہرگز لازم نہیں خصوصاً ایسے مدعی کے ذمہ جو کسی امر کے ثبوت کا دعویٰ یہ کہہ کر کرتا ہو کہ یہ امر خلاف عادت بطور معجزہ کے واقع ہوا یا قیامت میں خلاف عادت یوں ہوگا۔ اس کے ذمہ تو کسی قاعدہ سے بھی نظیر کا پیش کرنا لازم نہیں ہوسکتا۔ کیونکہ وہ تو اپنے دعوے میں تصریح کررہا ہے کہ مدعی بے نظیری کی صفت کے ساتھ متصف ہے(۱) اگر نظیر کا پیش کرنا کہ مدعی کے ذمہ کسی درجہ میں لازم بھی ہوسکتا ہے تو صرف اس مدعی کے ذمہ ہوسکتا ہے جو اپنے دعویٰ کو موافق عادت بتلائے اور جو خرق عادت کا مدعی ہو اس سے نظیر کا مطالبہ کرنا عجب ہے)

ثبوت کی حقیقت

اب میں آپ کو ثبوت کی حقیقت بتلاتا ہوں جس کے نہ جاننے کی وجہ سے لوگوں کا مذاق ایسا بگڑ گیا ہے کہ آج کل علماء سے معراج کی نظیر کا سوال ہوتا ہے شق القمر کی نظیر کا مطالبہ ہوتا ہے۔ تو سنئے یہ عقلی مسئلہ ہے کہ کسی خبر کا صحیح ہونا یا کسی امر کا واقع ہونا نظیر پر ہرگز موقوف نہیں۔ چنانچہ جن کو عقلیات سے کچھ بھی مس ہے وہ اس کو جانتے ہیں۔ مدعی اگر نظیر بیان کردے تو یہ اس کا تبرع ہے(۲) بلکہ ثبوت خبر کے لیے دو چیزوں کی ضرورت ہے ایک مخبر بہ(۳) کا ممکن ہونا، دوسرے مخبر کا صادق ہونا(۴)۔ پس ہمارے ذمہ تمام معجزات اور معادیات(۵) کے متعلق دو باتوں کا ثابت کرنا ہے۔ ایک یہ کہ وہ فی نفسہ ممکن ہوں، دوسرے مخبر صادق نے ان کے وقوع کی خبر دی ہو۔ ان دو باتوں کے ثابت کرنے کے بعد کسی کو انکار کا حق نہ ہوگا۔ اب ہم معراج وغیرہ اور پل صراط ووزن اعمال وغیرہ کے ثبوت پر دلیل قائم کرتے ہیں کہ یہ معجزات اور معادیات فی نفسہ ممکن ہیں(۶) یہ تو دلیل کا پہلا مقدمہ ہے۔ اگر کسی کو اس مقدمہ میں کلام ہو تو اس کو لازم ہے کہ ان کے امتناع پر(۷) دلیل قائم کرے اور ہم کو امکان پر دلیل قائم کرنے کی ضرورت نہیں۔ کیونکہ امکان کی کوئی علت نہیں ہوتی بلکہ امتناع پر دلیل نہ ہونا یہی امکان کی دلیل

(۱) جس چیز کا دعویٰ کیا گیا ہے اس کی کوئی مثال ہی نہیں ہے (۲) احسان ہے (۳) جس چیز کی خبر دی گئی اس کا ممکن الوجود ہونا (۴) خبر دینے والے کا سچا ہونا (۵) معجزات اور آخرت سے متعلق باتوں کے بارے میں (۶) آخرت میں واقع ہونے والی باتیں عقلاً ممکن ہیں (۷) ان کے ممکن نہ ہونے پر دلیل قائم کریں

ہے (اور اوپر معلوم ہو چکا کہ امتناع کہتے ہیں اجتماع نقیضین (۱) کو محل واحد میں آن واحد میں جہت واحدہ سے، تو جس کو ان امور کے امکان میں کلام ہو وہ ثابت کرے کہ ان میں اجتماع نقیضین (۲) کس طرح لازم آتا ہے)۔ دوسرا مقدمہ یہ ہے کہ جس امر ممکن کے وقوع کی مخبر صادق خبر دے وہ ثابت ہے (اور ان معجزات ومعادیات کے وقوع کی خبر مخبر صادق نے دی ہے) پس یہ امور واقع وثابت ہیں (۳)۔ اب ان مقدمات میں اگر کوئی کلام کرے تو اس کا جواب ہمارے ذمہ ہے باقی نظیر کا پیش کرنا ہمارے ذمہ نہیں۔ مثلاً اگر کوئی کہے پل صراط پر چلنا عقل کے خلاف ہے سمجھ میں نہیں آتا، تو میں کہوں گا کہ بتلاؤ کیوں سمجھ میں نہیں آتا۔ اس میں کیا استحالہ ہے کہ ایک باریک چیز پر پیر آجائے جب یہ محال نہیں اور مخبر صادق (۴) اس کے وقوع کی خبر دے رہا ہے تو پھر انکار کی کیا وجہ، اگر کوئی انکار کرے تو اس کا یہ حق تو ہے کہ امکان کو رد کرے اور امتناع کو ثابت کرے (۵) یا دوسرے مقدمہ میں کلام کرے کہ یہ مخبر صادق کی خبر نہیں تو ہم دلیل امتناع (۶) سننے کے لیے تیار ہیں، اور کلام اللہ کو کلام اللہ ثابت کرنا بھی ہمارے ذمہ ہے پس جب یہ دونوں باتیں ثابت ہوجائیں پھر ہم نظیر پیش کرنے کے ذمہ دار نہیں اور اگر نظیر ہم کو معلوم بھی ہو تب بھی نہ بتلائیں گے کیونکہ یہ ہمارے ذمہ نہیں ہے کہ ہم سب معاملات آپ کو بتلادیا کریں (۷)۔ ہاں اگر تم یہ ثابت کردو کہ مستدل کے ذمہ نظیر کا پیش کرنا ضروری ہے تو جب ثابت کروگے اس وقت دیکھا جائے گا۔ بدون اس کے ہم زوائد کے ساتھ جواب نہ دیں گے یہ عوام کو زیادہ تر جواب دینے والوں ہی نے خراب کیا ہے کہ وہ ہر بات میں

(۱) ایسی دو باتیں یا چیزیں جو ایک دوسرے کی ضد ہوں ایک پائی جائے تو دوسری کا پایا جانا محال ہو۔ جیسے آگ پانی کا ایک وقت میں ایک جگہ جمع ہونا محال ہے (۲) وہ بتائے کہ وقوع معجزات اور وقوع معاد میں دو نقیض ایک ساتھ کب جمع ہوتی ہیں (۳) یہ سب باتیں اور کام واقع ہوئے ہیں اور ان کا وقوع دلائل سے ثابت ہے (۴) نبی صلی اللہ علیہ وسلم (۵) اس کے واقع ہونے کی تردید کرے اور ممنوع ہونے کو ثابت کرے (۶) ممانعت کی دلیل (۷) آج کل باریک تار پر لفٹ چیئر پہاڑوں پر ایک طرف سے دوسری طرف لوگوں کو لے جاتی ہے جو مشاہدہ ہے اسی طرح اگر پل صراط پر چلنے کے لیے بھی قدموں میں کوئی برقی قوت اللہ پیدا فرمادیں کہ آدمی بال سے باریک پل صراط پر چل سکے تو اس میں کیا استبعاد ہے حدیث میں بھی آتا ہے کہ اس پر سے بعض لوگ برق رفتاری سے گزر جائیں گے۔ ۱۲ خ۔

تبرعاً نظیریں بیان کرنے لگے۔ عوام سمجھے کہ یہ بھی مجیب (۱) کے ذمہ ہے تو میں اس کا فیصلہ کرتا ہوں کہ مستدل کے ذمہ یہ ہرگز نہیں اور جو دعویٰ لزوم کا کرے وہ دلیل قائم کرے۔ یہ ہے دلیل مطرد (۲) جو تمام معجزات ومعادیات میں برابر چل سکتی ہے اور جو دلیلیں آج کل بیان کی جاتی ہیں جن میں زیادہ تر نظیر سے جواب دیا جاتا ہے وہ مطرد نہیں ہیں۔

اب میں عقلاً یہ ثابت کرتا ہوں کہ کسی واقعہ کا ثبوت نظیر پر موقوف نہیں۔ تقریر اس کی یہ ہے کہ یہ ظاہر ہے کہ نظیر بھی ایک واقعہ ہے میں پوچھتا ہوں کہ اس کے لیے بھی نظیر کی ضرورت ہے یا نہیں ہے وعلی ہذا۔ اگر ہر نظیر کے لیے نظیر کی ضرورت رہی تو مستحیل مسلسل لازم آئے گا (۳) اور نظیر سے ایک دعویٰ بھی ثابت نہ ہوسکے گا اور اگر کہیں جا کر ٹھہروگے کہ اس نظیر کے لیے کسی نظیر کی ضرورت نہیں تو معلوم ہوا کہ کسی واقعہ کا ثبوت بدون نظیر کے بھی ہوگیا تو پھر پہلے ہی کے لیے نظیر کی کیوں ضرورت ہے اور جس طرح تم نے اخیر میں ایک واقعہ کو بلانظیر مان لیا تو پہلے ہی کو بلانظیر کیوں نہیں مان لیتے۔ غرض کسی دلیل سے مستدل کے ذمہ نظیر کا بیان کرنا نہیں ہے ہاں اگر بیان کردے تو یہ اس کی شفقت ہے اور اس کا موقع اس وقت ہے جب کہ سائل دلیل کے مقدمات پر کلام کرنے سے عاجز ہوجاوے اور تسلیم کرلے کہ واقعی دلیل سے یہ دعویٰ ثابت ہوگیا اور مجھے اب انکار کا کوئی حق نہیں۔ اس وقت مجیب اگر تقریب فہم کے لیے کوئی نظیر دے دے تو اس کا احسان ہے (اور اگر وہ نظیر پر ثبوت دعویٰ کو موقوف بتلا رہا ہے تو مستدل نظیر ہرگز نہ بتلائے بلکہ اس سے اس توقف علی النظیر کی دلیل مانگے) چنانچہ اس وقت میں ثبوت پل صراط پر دلیل قائم کرکے اس کی ایک نظیر تبرعاً بتلاتا ہوں۔

پل صراط کی حقیقت

اول پل صراط کی حقیقت سمجھئے مگر یہ کہے دیتا ہوں کہ یہ مضمون ظنی ہے۔ اس صورت پر پل صراط کو سمجھنا واجب نہیں۔ اصل تو یہی ہے کہ آدمی عملاً پختہ عقیدہ رکھے۔ باقی بعض طبائع ضعیف ہوتی ہیں۔ ان کے لیے میں یہ مضمون بیان کرتا ہوں اگر وہ اس

(۱) جواب دینے والا (۲) مسکت دلیل ہے جو سب معجزات میں چل سکتی ہے (۳) محال کا تسلسل لازم آئے گا۔

طرح بھی پل صراط کو سمجھ لیں تو کچھ حرج نہیں مگر لازم بھی نہیں۔ لازم تو وہی اجمالاً مان لینا ہے۔ اس تنبیہ کے بعد کہتا ہوں کہ اول اس کی حقیقت سمجھو جس کے لیے اول یہ مقدمہ سنو کہ اس عالم کے سوا ایک عالم اور بھی ہے (مسلمان تو اس کا انکار نہیں کر سکتے۔ اور اگر انکار کریں تو ہمارے پاس ان کے جواب کے لیے وہی دلیل مطرد ہے جو اوپر مذکور ہوئی کہ دوسرے عالم کا ہونا ممکن ہے۔ کسی کو امکان پر کلام ہو تو دلیل امتناع قائم کرے اور جس ممکن کی خبر مخبر صادق (۱) نے دی ہو وہ ثابت ہے۔ پس دوسرا عالم ثابت ہے اور مخبر کے صادق ہونے کو ہم دلائل سے ثابت کر سکتے ہیں)

دوسرا مقدمہ یہ سنئے کہ عالم کے اختلاف سے بعض احکام اور حالات بدل جاتے ہیں (اس کی بھی دلیل تو وہی ہے جو مذکور ہوئی اور تقریب فہم کے لیے ایک نظیر بھی بتلاتا ہوں) جیسے اقالیم کے بدلنے سے بھی دنیا ہی میں حالات بدل جاتے ہیں (مثلاً یہاں اس وقت رات ہے اور ایک اقلیم میں اس وقت دن ہے۔ یہاں آج کل گرمی ہے اور کسی اقلیم میں اس وقت سردی ہے وعلیٰ ہذا) یہاں ۲۴ گھنٹے کا دن ہے اور بعض اقالیم میں چھ مہینے کا دن ہے اور چھ مہینے کی رات ہے اور یہیں سے معلوم ہوا ہوگا کہ قرآن میں جو آیا ہے کہ عالم آخرت کا ایک دن ہزار برس کے برابر ہے اور اس پر بعض لوگ ہنستے ہیں تو یہ ان کی حماقت ہے۔ اس میں استبعاد کیا ہے۔ جب عالم دنیا ہی میں اقلیم کے بدلنے سے یہ بات مشاہد ہے کہ بعض جگہ چھ ماہ کا دن ہوتا ہے تو اختلاف عالم کے بعد آخرت میں اگر ہزار برس کے برابر ایک دن ہو تو کیا تعجب ہے۔

تیسرا مقدمہ یہ ہے کہ اختلاف کی کوئی حد نہیں ہے نہ یہ منضبط ہو سکتا ہے (یہ مقدمہ بدیہی ہے محتاج دلیل نہیں اور جو شخص کسی حد پر انتہا اختلافات کا دعویٰ کرے اور اس سے آگے اختلاف ہونے کو ممتنع کہے وہ اس پر دلیل قائم کرے)

چوتھا مقدمہ یہ ہے کہ ممکن ہے جو چیز یہاں عرض ہو اس عالم میں جا کر جوہر ہو جائے (اس کا ممکن ہونا بھی ظاہر ہے۔ یہ تو مسلم ہے کہ ایک آن اور ایک محل میں شے واحد عرض (۲) و جوہر (۳) نہیں ہو سکتی۔ مگر یہ ہو سکتا ہے کہ ایک شے یہاں عرض ہو اور

(۱) جس کا وقوع ممکن ہو اور اسکی خبر رسول اللہ نے دی ہو تو وہ ثابت ہے (۲) کیفیت (۳) ذات شیٔ

دوسری جگہ جوہر ہوجائے اس کے امتناع پر کوئی دلیل قائم نہیں ہوسکتی اگر کسی کے پاس دلیل ہو پیش کرے) اور استیناس(۱) کے طور پر اس کو یوں سمجھئے کہ اس زمانہ میں بعض آلات کے ذریعہ سے حرارت و برودت (۲) وغیرہ کا وزن ہوتا ہے حالانکہ پہلے حکماء ان کو مقولہ کیف سے سمجھتے تھے جس کے لیے وزن ومقدار نہیں ہوسکتی مگر اس زمانہ میں ان کے لیے وزن ہونا بھی ثابت ہوگیا(۳) اسی لیے میں تو کہا کرتا ہوں کہ جتنی یہ نئی ایجادات ہیں سب معادیات (۴) کے سمجھنے کے لیے معین ومد ہیں۔ چنانچہ گراموفون ہاتھ پیر کے بولنے پر بڑی دلیل ہے کیونکہ گراموفون میں تو روح بھی نہیں اور کلام کرتا ہے تو اعضاء انسانی کے بولنے میں کیا تعجب ہے جن میں حیات کا تلبس ہے(۵)۔

اسی طرح ایک حدیث میں ہے جو نسائی میں موجود ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے صلوٰۃ کسوف کے موقع پر فرمایا کہ میں نے مسجد کی دیوار کے قریب جنت ودوزخ کو دیکھا۔ بعض لوگ اس پر ہنستے ہیں کہ جنت ودوزخ تو آسمان زمین سے بھی بڑی بتلائی جاتی ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو دیوار پر کیوں کر دیکھ لیا اور اصلی حالت پر کیسے دیکھ لیا۔ مگر خدا تعالیٰ نے فوٹو اور خوردبین کو ایجاد کرا کے اس استبعاد کو دور کر دیا فوٹو میں بڑی سے بڑی شے کو چھوٹا کر کے دکھایا جاسکتا ہے اور خوردبین سے چھوٹی سے چھوٹی چیز پہاڑ بنا کر دکھائی جاسکتی ہے تو کیا خدا تعالیٰ کو یہ قدرت نہیں کہ اس نے جنت ودوزخ کا فوٹو مسجد کی دیوار پر اتار دیا ہو اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شعاع(۶) میں خوردبین کی قوت رکھ دی ہو جس سے فوٹو کی چھوٹی چیزیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اصلی حالت پر نظر آگئیں ہوں(۷) اور حدیث میں یہی لفظ وارد ہے۔ مثلت لی الجنة والنار یہ نہیں فرمایا کہ جنت ودوزخ زمین میں آتی تھیں بلکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ وہ میرے لیے ممثل ہوگئیں(۸)۔ اسی لیے جب کوئی نئی ایجاد ہوتی ہے تو میں خوش ہوتا ہوں۔ کیونکہ ان سے سرعیات کا استبعاد(۹) دور ہوجاتا ہے چنانچہ ایک عجیب بات اس زمانہ میں یہ ہے کہ آج کل حرار و برودت (۱۰) کا بھی وزن ہونے لگا۔ کہ

(۱) مانوس ہونے کے لیے یوں سمجھ لیں (۲) گرمی سردی (۳) تھرمامیٹر سے بخار کی گرمی کا وزن کیا جاتا ہے، بلڈ پریشر وغیرہ کا وزن ہوتا ہے (۴) آخرت میں پیش آنے والے واقعات (۵) زندگی وابستہ ہے (۶) آنکھ کی بینائی میں (۷) L.E.D میں سب کچھ نظر آجاتا ہے (۸) بطور تمثیل دکھادی گئیں (۹) بعید ہونا (۱۰) گرمی سردی

اس مکان میں کس وزن کی حرارت ہے اور کس درجہ کی برودت ہے (اور بخار میں تھرمامیٹر سے مریض کی حرارت کا وزن کیا جاتا ہے) اب اگر کسی گنوار سے کہئے کہ گرمی بھی تلتی ہے تو اس کو کتنا تعجب ہوگا تو جب دنیا ہی میں بعض اعراض کا وزن ہونے لگا جس کی حقیقت ہے ما بہ الوزن کے انخفاض وارتفاع سے مقدار کا معلوم ہوجانا(۱) جو کہ سرسری نظر میں خواص جوہر(۲) سے ہے تو اگر دوسرے عالم میں جا کر وہ(۳) جوہر ہی بن جاوے تو کیا تعجب ہے۔ اور لیجئے اگر ایک برتن میں ٹھنڈا پانی بھر کر وزن کرو تو اور وزن ہوگا اور اسی میں گرم پانی بھر کر وزن کرو تو اور وزن ہوگا۔ آخر کمی بیشی کیوں ہے پانی کی مقدار تو دونوں حالتوں میں یکساں تھی۔ معلوم ہوا کہ برودت وحرارت کا کچھ وزن ہے۔ اب خواہ اس کو یوں تعبیر کر لیجئے کہ وزن پانی ہی کا ہے مگر بشرط برودت وحرارت کے مگر آخر ان کو وزن میں دخل تو ہوا تو اس عالم میں اگر یہی دخل درجہ موزونیت(۴) میں اس طرح ہوجاوے کہ یہ عرض جوہر بن جاوے تو کیا تعجب ہے۔ اور سنئے اطباء کہتے ہیں کہ جس شخص میں صفراء کا غلبہ زیادہ ہو وہ خواب میں آگ بہت دیکھتا ہے دیکھئے جو چیز یہاں عرض تھی یعنی حرارت صفراوی وہ عالم خیال میں آگ بن گئی جو کہ جوہر ہے۔ پس اس عالم میں عرض کا جوہر بن جانا کچھ بعید نہیں۔ اب پل صراط کی حقیقت سمجھئے گو اس کے بیان کی ضرورت نہیں کیونکہ مسلمان کا مذاق تو یہ ہونا چاہئے۔

حدیث مطرب ومے گوؤ راز دہر کمتر جو — کہ کس نکشود ونکشاید بحکمت ایں معمارا(۵)

اور میں کہہ چکا ہوں کہ میرے ذمہ اس کا بیان کرنا لازم نہیں۔ میرے ذمے تو وہی تھا جو میں بیان کر چکا ہوں مگر اس میں حظ نہ آیا تھا اس لیے تبرعاً بیان کرتا ہوں کہ خیر جس طرح بھی کام چلے اچھا ہے تو سنئے پل صراط کی حقیقت شریعت ہے۔ کما قال صاحب الکشف من العرفاء پس دنیا میں پل صراط کی نظیر شریعت میں موجود ہے اتنا فرق ہے کہ یہاں یہ عرض ہے اور وہاں جا کر جوہر بن جائے گی باقی اور تمام صفات میں یہ اس کی نظیر ہے جیسے وہ بال سے باریک ہے اور تلوار سے تیز ہے جس پر چلنا دشوار ہے۔

---

(۱) جس کی کمی بیشی سے جس کا وزن کیا جارہا ہے اس کے ہونے نہ ہونے کا پتہ چلتا ہے کہ بخار ہے یا نہیں (۲) ذات کے خواص میں سے ہے (۳) یعنی عرض کو اللہ تعالیٰ جوہر ہی بنادے تو کیا مشکل ہے (۴) وزن ہونے کے اعتبار سے ایسے ہو کہ تمام عوارض کو جوہر بنا کر وزن کر لیا جائے تو کیا تعجب ہے (۵) ''محبت اور عشق الٰہی کا بیان کرو، راز دہر کے پیچھے نہ پڑو اس لیے کہ کسی نے حکمت ودانائی سے اس معمہ کو حل نہیں کیا اور نہ کر سکے گا''

طریق شریعت

اسی طرح طریق شریعت نہایت باریک اور نازک ہے جس پر استقامت سے چل لینا ہر اک کا کام نہیں۔ کیونکہ شریعت مقدسہ مرکب ہے علم و عمل سے۔ تو اس پر چلنے کے لیے دو قوتوں کی ضرورت ہے۔ ایک قوت علمیہ کی دوسرے قوت عملیہ کی۔ قوت علمیہ کا تعلق عقل سے ہے اور قوت عملیہ کا تعلق ارادہ سے۔ پھر عمل بعض مفسد ہیں (۱) اور بعض مضر (۲) تو اس میں کہیں تو جلب منفعت (۳) کی ضرورت ہے اور کہیں دفع مضرت (۴) کی اور جو ارادہ جلب منفعت (۵) سے متعلق ہو اس کو قوت شہویہ کہتے ہیں اور جو دفع مضرت کے متعلق ہو اس کو قوت غضبیہ (۶) کہتے ہیں۔ تو شریعت پر چلنے کے لیے تین قوتوں کی ضرورت ہوئی۔ (۱) قوت عقلیہ (۲) قوت شہویہ (۳) قوت غضبیہ یہی اصول اخلاق کہلاتا ہیں، پھر ان میں سے ہر ایک کے تین درجے ہیں، افراط، تفریط، توسط (۷) اور شریعت نام ہے توسط کا، شریعت میں افراط عقل (۸) سے بھی کام نہیں چلتا نہ تفریط (۹) سے کام چلتا ہے بلکہ توسط کی ضرورت ہے جس کا نام حکمت ہے۔ اور قوت عقلیہ کے افراط کا نام جزیرہ ہے (۱۰)۔ یہ نہایت مضر (۱۱) ہے۔ جب عقل بہت بڑھ جاتی ہے تو ہر چیز میں احتمالات عقلیہ پیدا ہونے لگتے ہیں جس سے آدمی وہمی ہوجاتا ہے۔ جیسے اہل فلسفہ میں ایک فرقہ لا ادریہ مشہور ہے وہ کسی حقیقت کا وجود تسلیم نہیں کرتے اور کہتے ہیں کہ بہت دفعہ ایسا ہوتا ہے کہ ہم ایک چیز کو دور سے دیکھ کر آدمی سمجھتے ہیں اور وہ گدھا نکلتا ہے بہت لوگ ایک شخص کو حسین سمجھتے ہیں اور بہت سے اس کو بدصورت سمجھتے ہیں بعض لوگ ایک چیز کو میٹھا بتلاتے ہیں اور بخار والا اسے کڑوی بتلاتا ہے۔ اسی طرح مسائل عقلیہ میں کوئی ایک دلیل کو صحیح کہتا ہے کوئی غلط تو جب ہمارے حواس ظاہرہ اور باطنہ میں اتنا اختلاف ہے اور کبھی ان سے غلطی بھی ہوجاتی ہے تو یہ کیا اطمینان ہے کہ جس کو ہم نے آدمی سمجھا ہے اور وہ آدمی ہی ہے گدھا نہیں۔ اور جس کو ہم زمین کہتے ہیں وہ

(۱) خراب (۲) نقصان دہ (۳) حصول نفع کی ضرورت ہے (۴) نقصان سے بچنے کی (۵) حصول نفع کے ارادے کو (۶) غصہ کی کیفیت (۷) زیادتی، کمی، درمیانہ روی (۸) عقل کی زیادتی (۹) کمی (۱۰)۔۔۔۔ (۱۱) نقصان دہ

زمین ہی ہے آسمان نہیں۔ ممکن ہے ہماری نظر نے غلطی کی ہو اور جس بات کو ہم حق سمجھتے ہیں ممکن ہے وہاں ہماری فہم نے غلطی کی ہو۔ بس اب ان کا حال یہ ہو گیا کہ ہر بات میں ان کو شک ہے اور شک میں بھی شک ہے۔

عقل کی حد

تو حضرت یہ عقل جب بڑھتی ہے تو اتنا پریشان کرتی ہے کہ زندگی تباہ کر دیتی ہے۔ اور یہی وجہ ہے بہت سے عقلاء کے تباہ ہونے کی کہ انہوں نے عقل سے وہ کام لیا جو اس کی حد سے آگے تھا اور ہر چیز کا اپنی حد سے نکل جانا مضر ہے، میں تو عقل کے متعلق ایک مثال دیا کرتا ہوں کہ یہ ایسی ہے جیسے گھوڑا پہاڑ پر چڑھنے والے کے لیے۔ اب تین قسم کے لوگ ہیں۔ ایک تو وہ جو گھوڑے پر سوار ہو کر پہاڑ تک پہنچے اور پھر پہاڑ پر بھی اسی پر سوار ہو کر چڑھنے لگے۔ یہ غلطی پر ہیں ضرور کسی سیدھی چڑھائی پر سوار اور گھوڑا دونوں گریں گے اور ایک وہ ہیں جو یہ سمجھ کر کہ گھوڑا پہاڑ پر تو کام دیتا ہی نہیں تو اس سے صاف سڑک پر بھی کام لینے کی کیا ضرورت ہے وہ گھر ہی سے پیدل چل پڑے نتیجہ یہ ہوا کہ پہاڑ پر پہنچ کر تھک گئے یہ بھی نہ چڑھ سکے۔ تو ان دونوں کی رائے غلط تھی۔ پہلی جماعت نے گھوڑے کو ایسا بیکار سمجھا کہ اخیر تک اسی سے راستہ طے کرنا چاہا اور دوسرے نے ایسا بیکار سمجھا کہ پہاڑ تک بھی اس سے کام نہ لیا۔ صحیح بات تو یہ ہے کہ گھوڑا پہاڑ تک تو کارآمد ہے اور پہاڑ پر چڑھنے کے لیے بے کار۔ اس کے لیے کسی اور سواری کی ضرورت ہے۔ یہی حال عقل کا ہے کہ عقل سے بالکل کام نہ لینا بھی حماقت ہے اور اخیر تک کام لینا بھی غلطی ہے۔ بس عقل سے اتنا کام لو کہ توحید و رسالت کو سمجھو اور کلام اللہ کا کلام اللہ ہونا معلوم کر لو۔ اس سے آگے فروع (۱) میں عقل سے کام نہ لینا چاہئے بلکہ اب خدا اور رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے آگے گردن جھکا دینی چاہئے چاہے ان کی حکمت عقل میں آوے یا نہ آوے۔

دیکھئے قانون سلطنت کے منوانے کی دو صورتیں ہیں ایک یہ کہ پہلے یہ سمجھا دیا جائے کہ جارج پنجم بادشاہ ہیں اس کے بعد تمام احکام کے متعلق یہ کہہ دیا جائے کہ

(۱) فروعے مسائل میں عقلی گھوڑے نہ دوڑاؤ جب قرآن کا کتاب اللہ ہونا اور رسول کا نبی ہونا عقلی دلائل سے ثابت ہو گیا تو جو اس کا حکم ہے اس پر عمل کرو

بادشاہ کے احکام ہیں اس لیے ماننا پڑیں گے تو یہ صورت آسان ہے اور تمام عقلاء ایسا ہی کرتے ہیں۔ دوسری صورت یہ ہے کہ ایک شخص جارج پنجم کو بادشاہ مان کر پھر بھی ہر قانون میں الجھنے لگے کہ میں اس دفعہ کو نہیں مانتا تو بتلایئے اس شخص کا کیا حال ہوگا۔ ظاہر ہے کہ ہر جگہ ذلیل ہوگا اور عقلاء کہیں گے کہ جب بادشاہ کا بادشاہ ہونا مسلم، اور اس قانون کا قانون سلطنت ہونا معلوم تو پھر انکار کی کیا وجہ؟ ضرور ماننا پڑے گا چاہے سمجھ میں آئے یا نہ آئے۔ معلوم ہوا کہ صاحب سلطنت کے پہچاننے کے لیے تو عقل سے کام لینے کی اجازت ہے اس کے بعد عقل سے کام لینے کی اجازت نہیں، پھر کیا وجہ کہ آپ دین کے معاملہ میں اخیر تک عقل سے کام لینا چاہتے ہیں یہ سخت غلطی ہے جس سے بجز ذلت کے اور کچھ حاصل نہ ہوگا۔ جب خدا کا ہونا مسلم تو رسول کا رسول ہونا مسلم، کلام اللہ کا کلام اللہ ہونا معلوم پھر ہر حکم میں الجھنے کا آپ کو کیا حق ہے اور ہر شخص آپ کو بے وقوف بنائے گا اور تمام عقلاء کی نظروں میں آپ ذلیل ہوں گے سچ یہ ہے۔

عزیز یکہ از در گہش سر بتافت بہر درکہ شد ہیچ عزت نیافت(۱)

غرض عقل سے اس وقت تک کام لو جب تک وہ کام دے سکے اور جہاں اس کو کام نہیں وہاں اس کو چھوڑ دو اور حکم کا اتباع کرو تو عقل کی بھی ایک حد ہوئی اور کیوں نہ ہو وہ بھی تو ایک قوت ہے جیسے آنکھ کی ایک قوت ہے اور اس کی ایک حد ہے۔ اس سے آگے دور بین لگانے کی ضرورت ہے ایسے ہی شریعت کے معاملہ میں اصول تک تو عقل کام دیتی ہے اور فروع میں یہ تنہا بیکار ہے دور بین وحی سے کام لینا ضروری ہے۔ ایسے ہی کان کی ایک قوت ہے جس کے لیے ایک حد ہے کہ اس سے آگے ٹیلی فون سے مدد لینے کی ضرورت ہے۔ پیروں کی ایک قوت ہے جس سے آگے سواری سے مدد لینے کی ضرورت ہے تو جب ہر قوت محدود ہے تو عقل کیسے محدود نہ ہوگی۔ ضرور ہوگی اس سے آگے وحی سے کام لو ورنہ یاد رکھو کہ عمر بھر رستہ نہ ملے گا۔ کیونکہ سمعیات میں عقل کا کام نہیں وہاں تو اتباع رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ضرورت ہے اور

(۱) ”وہ اللہ ایسے غالب اور قادر ہیں کہ جس نے ان کی درگاہ سے سر پھیرا جس دروازہ پر بھی گیا کچھ عزت نہ پائی بلکہ ذلیل ہوا“

خلاف پیمبر کسے راہ گزید کہ ہرگز بمنزل نخواھد رسید(۱)

تقلید کی ضرورت

صاحبو! دنیا میں بھی تو آپ بہت جگہ عقل کو چھوڑ کر کسی نہ کسی کا اتباع کرتے ہیں۔ جب آپ بیمار ہوتے ہیں تو عقل سے اتنا کام تو لیتے ہیں کہ اطباء موجودین میں سے کون زیادہ حاذق وتجربہ کار ہے۔ جب ایک طبیب کا حاذق ہونا معلوم ہوگیا تو پھر آپ اس کے پاس جاتے ہیں اور وہ نبض دیکھ کر نسخہ تجویز کرتا ہے۔ پھر آپ اس سے یہ نہیں پوچھتے کہ اس نسخہ میں فلاں دوا کیوں لکھی اور فلاں کیوں نہ لکھی اور اس دوا کا وزن چار ماشہ کیوں لکھا چھ ماشہ کیوں نہ لکھا ہم نے کسی کو طبیب سے ان باتوں میں الجھتا ہوا نہیں دیکھا اور اگر کوئی اس سے الجھنے لگے تو سب عقلاء اس کو بے وقوف بتاتے ہیں اور طبیب بھی صاف کہہ دیتا ہے کہ اگر تم میرے پاس مجھ کو طبیب سمجھ کر آئے ہو تو جو نسخہ میں تجویز کردوں اس میں تم کو چون وچرا کا کوئی حق نہیں، اور اگر چون وچرا کرتے ہو تو اس کے معنی یہ ہیں کہ تم مجھ کو طبیب نہیں سمجھتے۔ پھر میرے پاس کیوں آئے تھے اور اس کے اس جواب کو تمام عقلاء صحیح کہتے ہیں۔ پھر حیرت ہے کہ رسول کو رسول تسلیم کرنے اور کلام اللہ کو کلام اللہ مان لینے کے بعد عقل کو ان کے تابع نہ کیا جاوے اور بات بات میں الجھا جائے کہ یہ تو خلاف عقل ہے ہم اسے کیوں کر مان لیں۔ صاحب اگر تم نے رسول کو رسول مان لیا ہے تو پھر ہر بات کو بلا چون وچرا ماننا پڑے گا اور یہ کہنے کا حق نہ ہوگا کہ ہماری عقل میں یہ بات نہیں آتی ورنہ اس کے معنی یہ ہیں کہ تم نے اب تک رسول کو رسول ہی نہیں سمجھا اور کلام اللہ کو کلام اللہ ہی نہیں مانا۔ افسوس! دنیا کے کاموں میں تو عقل کی ایک حد ہو اور طبیب کو طبیب مان لینے کے بعد اس کی تجویز میں عقل کو دخل نہ دیا جاوے اور امور آخرت میں اس کی کوئی بھی حد نہ ہو۔

صاحبو! جب دنیا کے کام بدون اس کے نہیں چل سکتے کہ عقل کو ایک حد پر چھوڑ دیا جائے اور بلا چون وچرا دوسرے کا اتباع کیا جائے تو آخرت کا کام بدون اس کے کیونکر چلے گا کیونکہ دنیا کی چیزیں تو دیکھی ہوئی بھی ہیں۔ ان میں کسی قدر عقل چل سکتی ہے پھر بھی اس کو چھوڑ کر کاملین وماہرین کی تقلید کی جاتی ہے اور آخرت سے تو ہم سب

(۱) ''پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے راستہ کے خلاف جس نے اور راستہ اختیار کیا وہ ہرگز منزل مقصود تک نہ پہنچے گا''

اندھے ہیں وہاں بدون تقلید وحی کے کیسے کام چلے گا اور اگر اس میں عقل سے کام لیا گیا تو وہی مثال ہوگی جیسے ایک اندھے نے کہا تھا کہ یہ تو بڑی ٹیڑھی کھیر ہے۔شان ورود اس کا یہ ہے کہ ایک لڑکا اپنے اندھے حافظ کے لیے گھر سے کھیر کی دعوت کرنے آیا۔ حافظ جی نے پوچھا کہ کھیر کیسی ہوتی ہے کہا سفید ہوتی ہے حافظ جی نے سفید سیاہ میں کیوں فرق کیا تھا۔ان کے نزدیک نہ تو کوئی چیز سفید تھی نہ سیاہ۔ کیوں کہ آنکھیں ہی نہیں تھیں۔تو آپ پوچھتے ہیں کہ سفید کیسا ہوتا ہے اس نے کہا جیسے بگلا، حافظ جی نے پوچھا کہ بگلا کیسے ہوتا ہے۔لڑکے نے ہاتھ کو اس طرح موڑ کر کہا کہ ایسا ہوتا ہے۔ حافظ جی نے جو اپنا ہاتھ پھیر کر اس شکل سے تصور کیا تو کہنے لگے بھائی یہ تو بڑی ٹیڑھی کھیر ہے میرے گلے سے کیوں کر اترے گی۔تو دیکھئے جو چیز آنکھ سے دیکھی نہ ہو اس میں عقل سے کام لینے کا یہ نتیجہ ہوا کہ معمولی سی کھیر کا کیا سے کیا بن گیا جس میں چبانے اور نگلنے کی بھی مشقت نہ تھی اب وہ گلے میں پھنسنے لگی تو واقعی اندھے کو کوئی کیوں کر سمجھائے کہ سفید رنگ کیسا ہوتا ہے۔ اگر حافظ جی ساری عمر بھی اسی سبق میں رہیں تب بھی نہیں سمجھ سکتے۔ بس اس کا طریقہ تو یہ ہے کہ کسی خیر خواہ سوا نکھے (۱) کی تقلید کر لی جائے۔اسی طرح اگر تم کسی ولایتی کو جس نے آم کبھی نہ کھایا ہو آم کا مزہ سمجھانا چاہو تو کیا وہ سمجھ جائے گا۔ ہرگز نہیں، تم کہو گے کہ آم میٹھا ہوتا ہے وہ کہے گا کہ ہم تو روز گڑ کھاتے ہیں بس آم ایسا ہی ہوگا۔صاحب اس کو سمجھانے کا طریقہ یہ ہے کہ ایک آم لا کر اسے کھلا دو اور اگر یہ نہیں تو پھر اس کو تقلیداً مان لینا چاہئے اور اپنی عقل سے اسکی نظیریں نہ نکالنا چاہئیں۔

اسی طرح امور آخرت کو اگر پوری طرح سمجھنے کا شوق ہے تو اس کی صورت یہ ہے کہ موت کے منتظر رہو۔ مرنے کے بعد پل صراط اور وزن اعمال وغیرہ سب کی حقیقت سامنے آجائے گی۔اور اگر دنیا ہی میں سمجھنا چاہتے ہو تو اس کے سوا چارہ نہیں کہ قرآن ورسول ﷺ نے جو کہہ دیا ہے اس کی تقلید کرو۔ اور ان کی نظیریں دریافت کرنے کے درپے نہ ہو۔مثالوں سے تم آخرت کی حقیقت ایسی ہی سمجھو گے جیسے حافظ جی نے کھیر کو ٹیڑھا بتلایا تھا۔پس خوب سمجھ لو کہ عقل کی ایک حد ہے جس سے بڑھ جانا مضر ہے۔

(۱) آنکھوں والے کی

نتیجہ افراط وتفریط(۱)

اطباء نے بھی تو اس کو مضر لکھا ہے اور امراض میں سے شمار کیا ہے کیونکہ افراط عقل(۲) کا نتیجہ اوہام وشکوک میں (۳) ابتلا ہے جس سے قلب ودماغ دونوں ضعیف ہوجاتے ہیں۔ فارابی کی حکایت ہے کہ ایک شخص حلوا بیچتا پھرتا تھا اس سے پوچھا کیف تبیع الحلوا۔ تو حلوہ کس طرح بیچتا ہے؟ اس نے جواب دیا۔ کذا بدانق کہ ایک دانگ میں اتنا دیتا ہوں تو آپ کہتے ہیں۔ اسئلک عن الکیفیة وتجیبنی عن الکمیة میں تو کیفیت سے سوال کرتا ہوں اور تو کمیت سے جواب دیتا ہے۔ آپ حلوائی سے الجھ گئے۔ اس کو عقل کا ہیضہ کہتے ہیں کہ ہر وقت اسی کے چکر میں رہے۔ چنانچہ افراط عقل ہی کا یہ نتیجہ تھا کہ فلاسفہ نے انبیاء علیہم السلام کا مقابلہ کیا اور جب عاجز ہوگئے تو ان کی نبوت کا تو اقرار کیا مگر کہنے لگے کہ یہ جاہلوں کے واسطے نبی ہیں ہم کو نبی کی ضرورت نہیں۔ نحن قوم هذبنا انفسنا بالحکمة ہم نے تو اپنے کو حکمت سے مہذب بنالیا ہے حق تعالیٰ ایسے ہی لوگوں کے حق میں فرماتے ہیں: فَرِحُوْا بِمَا عِنْدَهُمْ مِّنَ الْعِلْمِ (۴) یہ لوگ اپنے علم پر نازاں ہوگئے اور یہ نہ سمجھے کہ علوم نبوت عقل سے باہر ہیں چنانچہ الٰہیات میں فلاسفہ نے جو تحقیقات بیان کی ہیں ان میں اتنی ٹھوکریں کھائی ہیں کہ آج مسلمانوں کا ایک ادنیٰ طالب علم بھی ان پر ہنستا ہے۔ یہ تو افراط فی العقل ہے اور ایک ہے تفریط کا درجہ یعنی عقل کی کمی اس کو حماقت کہتے ہیں۔ شریعت میں یہ دونوں درجے بیکار اور مذموم (۵) ہیں۔

روح شریعت

بلکہ مطلوب توسط ہے (۶) جس کو حکمت کہتے ہیں، دوسری قوت شہویہ ہے اس میں بھی تین درجے ہیں۔ ایک افراط جس کا نام فجور ہے شریعت میں یہ بھی مطلوب نہیں۔ کیونکہ اس کا انجام فسق ہے اور ایک تفریط ہے کہ آدمی نامرد بن جائے کہ ضروری انتفاعات (۷) سے بھی محروم ہو۔ یہ بھی مطلوب نہیں (کیونکہ اس سے ہمت اور حوصلہ

(۱) زیادتی کمی کا نتیجہ (۲) عقل کی زیادتی (۳) مختلف قسم کے وہم اور شک میں گرفتار ہوجاتا ہے (۴) ''اترانے لگے اس پر جو ان کے پاس تھی خبر'' (۵) ناپسندیدہ (۶) میانہ روی (۷) ضرور فائدہ اٹھانے سے

پست ہوجاتا ہے اور اولوالعزمی اور اخلاق عالیہ مفقود ہوجاتے ہیں جو بڑا نقص ہے) اور ایک ہے توسط جس کا نام عفت ہے(۱) یہ مطلوب ہے۔ تیسری چیز قوت غضبیہ ہے۔ اس میں بھی تین درجے ہیں، ایک افراط جس کو تہور(۲) کہتے ہیں کہ موقع بے موقع کچھ نہ دیکھے اندھا دھند جوش دکھانے لگے جیسا آج کل ہورہا ہے کہ جس طرف چلتے ہیں جوش میں اندھے بن کر چلتے ہیں۔ یہ بھی نہیں دیکھتے کہ اس جوش سے نفع ہوگا یا نقصان۔ یہ بھی شریعت میں مطلوب نہیں اور ایک ہے تفریط جس کو جبن اور بزدلی کہتے ہیں کہ موقع اور ضرورت کے وقت ہمت سے کام نہ لیا جائے جیسے بعض لوگ ایسے ڈرپوک ہوتے ہیں کہ حکام کے سامنے ادب اور تہذیب سے بھی اپنی حاجات ظاہر نہیں کرسکتے، یہ بھی مطلوب نہیں۔ اور ایک درجہ توسط کا ہے جس کا نام شجاعت ہے یہ مطلوب ہے اس کا حاصل یہ ہے کہ ضرورت اور موقع پر جوش ظاہر کیا جائے جہاں نفع کا ظن غالب ہو اور بے موقع جوش سے کام نہ لیا جائے جہاں نفع کی کچھ امید نہیں محض نقصان ہی نقصان ہے۔

غرض اخلاق پسندیدہ کے اصول تین ہیں ۔ (۱) حکمت (۲) عفت (۳) شجاعت اور ان کے مجموعہ کا نام عدل ہے اور یہی شریعت کا حاصل ہے اور قرآن میں جو فرمایا ہے وَ كَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا(۳) اس سے بھی عدل مراد ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ہم نے (ایک ایسی شریعت دے کر جو کہ سراپا عدل ہے) امت وسط یعنی امت عادلہ بنایا۔ ایک مقدمہ اور لیجئے کہ وسط دو قسم کا ہوتا ہے۔ ایک وسط حقیقی ایک وسط عرفی۔ وسط حقیقی وہ خط ہے جو بالکل بیچوں بیچ ہو وہ قابل تقسیم نہیں ہوتا۔ اور ایک وسط عرفی ہے جیسے کہا کرتے ہیں کہ یہ ستون مکان کا وسط ہے تو وہ وسط حقیقی نہیں کیونکہ وہ تو منقسم ہے اس کے اندر بھی ایک جزو دائیں اور ایک جزو بائیں اور ایک بیچ میں نکل سکتا ہے پھر وہ وسط حقیقی کہاں سے ہوا۔ حقیقی وسط تو وہ ہے جس میں دایاں بایاں کچھ نہ نکل سکے۔ سو ایسا وسط ہمیشہ غیر منقسم ہوگا۔ پس سمجھ لو کہ شریعت اس وسط کا نام ہے جس میں افراط تفریط کا ذرا بھی نام نہ ہو بلکہ عین توسط ہو یہی وسط حقیقی روح شریعت ہے اور یہی کمال ہے اور اوپر معلوم ہوچکا کہ وسط حقیقی ہمیشہ غیر منقسم ہوتا ہے تو شریعت کی روح بھی غیر منقسم ہے چنانچہ جن اصول اخلاق کو میں نے بیان کیا

(۱) پاکدامنی (۲) جوش (۳) سورۃ البقرۃ: ۱۴۳

ہے ان میں افراط وتفریط کو چھوڑ کر جو ایک وسط نکلے گا جس کو نہ افراط کی طرف میلان ہوگا نہ تفریط کی طرف وہ ہمیشہ غیر منقسم ہوگا اور ایسے وسط پر رہنا ضرور دشوار ہے۔

پس شریعت ان دونوں جانبوں پر نظر کر کے اپنی دشواری کی وجہ سے تلوار سے تیز اور بوجہ غیر منقسم ہونے کے بال سے باریک ہوگی۔ کیونکہ بال بھی منقسم ہے اور وسط حقیقی غیر منقسم ہے پس قیامت میں یہی شریعت یعنی وسط حقیقی جوہر بن کر(۱) پل صراط کی شکل میں ظاہر ہوگا جس پر سے مسلمانوں کو چلایا جائے گا پس جو شخص دنیا میں شریعت پر تیزی وسہولت کے ساتھ چلا ہوگا وہ وہاں بھی تیزی کے ساتھ چلے گا کیونکہ وہ یہی شریعت تو ہوگی جس پر دنیا میں چل چکا ہے اور جو یہاں نہیں چلا یا کم چلا ہے وہ پل صراط پر بھی نہ چل سکے گا یا سستی کے ساتھ چلے گا۔ لیجئے میں نے آپ کو پل صراط کی نظیر بھی دکھلا دی، اب تو کوئی اشکال نہیں رہا۔ اسی طرح ہمارے پاس تمام شرعیات کے لیے عقلی نظائر موجود ہیں یہ نہ سمجھئے کہ یہ پل صراط ہی کی خصوصیت ہے لیکن ہم ان تحقیقات کو مقصود نہیں سمجھتے ہمارا اصلی مذہب تو یہ ہے کہ

ما قصہ سکندر ودارا نخواندہ ایم　　از ما بجز حکایت مہروفا مپرس(۲)

انکشاف اسرار وحقائق

باقی میں نے نمونہ کے طور پر تحقیق اس لیے بیان کر دی تا کہ معلوم ہوجائے کہ ہمارے پاس ہر مسئلہ میں ایسی ہی تحقیقات موجود ہیں اور سمجھ میں آجائے کہ علوم شرعیہ کے سامنے علوم فلسفہ کی کچھ بھی وقعت نہیں جس میں سے نمونہ کے طور پر اس وقت میں نے کچھ بیان کر دیا ہے تا کہ آپ علماء اسلام کو تحقیقات سے خالی نہ سمجھیں بحمداللہ ہمارے پاس ان تحقیقات کا ذخیرہ بھی بہت زیادہ ہے۔ لیکن

مصلحت نیست کہ از پردہ بروں افتد راز　　ورنہ در مجلس رنداں خبرے نیست کہ نیست(۳)

مصلحت اس واسطے نہیں کہ ہر شخص اس قسم کی تحقیقات بتلانے کے قابل نہیں اور جو قابل ہوں ان کو بھی ہم نہیں بتلاتے کیونکہ ان کا بتلانا ہمارے ذمہ نہیں (کیونکہ طبیب کے ذمہ صرف نسخہ بتلانا ہے اس کی رعایت اور ترکیب کے اسرار اور وزن کی علت

(۱) جسم کی صورت میں (۲) ''ہم نے سکندر ودارا کے قصے نہیں پڑھے ہم سے مہر ووفا کے قصوں کے علاوہ اور نہ دریافت کرو'' (۳) ''مصلحت وقت نہیں کہ راز کو پردہ سے باہر نکالا جائے ورنہ رندوں کی مجلس میں ایسی کوئی خبر نہیں جو نہ پہنچی ہو''

بتلانا اس کے ذمہ نہیں) ہاں بعض قابلوں کو بتلا بھی دیتے ہیں جو ہمارے پاس آ کر رہیں اور ہمارے کہنے کے موافق عمل کریں۔ اطاعت میں پختگی ظاہر کریں۔ ایسے شخص کو کبھی نشاط میں آ کر خود ہی بتلا دیتے ہیں اور پوچھنے پر اسے بھی نہیں بتلاتے کیونکہ یہ اسرار ہیں جن کو نشاط کے وقت خود ہی بیان کر دیا جاتا ہے اور ان کا از خود کسی کا پوچھنا ناگوار گزرتا ہے۔ (جیسے طبیب بعض دفعہ خود خوشی میں آ کر مریض سے خود اپنے نسخہ کی تعریف اور حقیقت بیان کر دیتا ہے اور اگر مریض پوچھے تو اسے ناگوار ہوتا ہے۔ جیسے کوئی شخص بادشاہ کا مطیع و محبوب ہو تو بادشاہ اسے کبھی اپنے محل کی سیر بھی کرا دیتا ہے کہ دیکھو یہ خزانہ ہے اور یہ چور دروازہ ہے اور یہ ہماری بیگمات کے رہنے کی جگہ ہے۔ یہ آرام گاہ ہے لیکن اگر وہ از خود پوچھنے لگے کہ حضور کی بیگم کہاں رہتی ہے اور خزانہ کہاں ہے تو ایسی بے نقط سنائی جائیں گی کہ حواس باختہ ہو جائیں گے پس اسرار کے دریافت کرنے کی درخواست بھی ایسی ہی درخواست کے مشابہ ہے۔ تو میں نے اسرار کی حقیقت بھی بتلا دی ان کے معلوم کرنے کا طریقہ بھی بتلا دیا۔ اگر کسی کو شوق ہو تو اس طریقے سے عمل شروع کر دے یعنی اطاعت میں لگ جائے میں سچ کہتا ہوں کہ تم ہمارے اس کہنے پر عمل کرنے لگو تو پھر تم کو دریافت کی بھی ضرورت نہ ہوگی۔ خود ہی سب حقائق منکشف ہو جائیں گے اور یہ حال ہوگا۔

بینی اندر خود علوم انبیاء بے کتاب و بے معید واوستا(۱)

اور جن کو یہ حقائق حاصل ہوئے ہیں محض عمل اطاعت ہی سے حاصل ہوئے ہیں

فہم و خاطر تیز کردن نیست راہ جز شکستہ می نگیر و فضل راہ(۲)

یہ اسرار عقل پرستی اور فہم کے تیز کرنے سے معلوم نہیں ہوتے بلکہ شکستگی اور انقیاد(۳) سے خدا کا فضل متوجہ ہو جاتا ہے آگے بتلاتے ہیں کہ اس شکستگی پر فضل کس طرح ہوتا ہے۔

ہر کجا پستی ست آب آنجا رود ہر کجا مشکل جواب آنجا رود

ہر کجا دردے دوا آنجا رود ہر کجا رنجے شفا آنجا رود(۴)

---

(۱) ''اپنے اندر بے کتاب اور بغیر مددگار استاد کے انبیاء علیہم السلام جیسے علوم دیکھو گے'' (۲) عقل و فہم کو تیز کرنا طریق نہیں ہے فضل الٰہی بجز شکستگی کے متوجہ نہیں ہوتا (۳) عاجزی اور اطاعت گزاری سے (۴) ''جس جگہ نشیب ہو اسی طرف پانی رواں ہوتا ہے جہاں مشکل پیش آتی ہے وہاں ہی جواب دیا جاتا ہے۔ جہاں بیماری ہوتی ہے وہیں دوا کا استعمال ہوتا ہے اور جہاں مرض ہوتا ہے وہاں شفا جاتی ہے''

پس فضل اطاعت وعبدیت سے ہوتا ہے کہ آدمی اپنے کو فنا کردے، اپنی عقل وفہم کو ناقص سمجھ کر چھوڑ دے فرماتے ہیں۔

سالہا تو سنگ بودی دلخراش آزموں را یک زمانے خاک باش(۱)

یعنی عقل کی اطاعت میں سنگ دل بنے ہوئے تو بہت دن ہوگئے اس نے کچھ بھی حقیقت نہ بتلائی اب ذرا کچھ دنوں خاک ہوکر دیکھو پھر کیا ہوگا فرماتے ہیں۔

در بہاراں کے شود سرسبز سنگ خاک شو تا گل بروید رنگ رنگ(۲)

پھر تمہارے اندر عجیب عجیب علوم القا ہوں گے۔ صاحب یہ ہے طریقہ علوم عالیہ حاصل کرنے کا خوب سمجھ لیجئے۔

عقل کا معارضہ

مگر اس وقت مذاق ایسا فاسد(۳) ہوا ہے کہ ہر شخص علوم عالیہ(۴) کے درپے ہے اور اپنی عقل سے ان کو دریافت کرنا چاہتا ہے حالانکہ عقل سے تو یہ بھی معلوم نہیں ہوسکتا کہ میں کس کا بیٹا ہوں اور میرا باپ کون ہے۔ کانپور میں ایک جنٹلمین نے اپنے باپ کو لکھا تھا کہ یہ کاہے سے معلوم ہوا کہ آپ میرے باپ ہیں اس کی عقلی دلیل کیا ہے اس نے واقعی درایت پر عمل کیا عقل کا تو مقتضا یہ ہے کہ جاہل کی اولاد بھی جاہل ہی ہو۔ یہ عقل میں کیونکر آسکتا ہے کہ باپ تو جاہل لٹھ ہو اور بیٹا انٹرینس پاس کرکے فلسفی بن جائے دلیل عقلی تو اس بات کو ثابت کرنہیں سکتی۔ اسی لیے اس نے کہا کہ بتلاؤ کاہے سے معلوم ہوا کہ تم میرے باپ ہو۔ اس کا جواب اگر ہے تو یہی ہے کہ دایہ سے پوچھ لے جس نے تجھے ماں کے پیٹ سے جنایا تھا اور ماں سے پوچھ لے کہ وہ کیوں کر حاملہ ہوئی تھی تو یہ عقل تو بڑی نکمی چیز نکلی جس سے باپ کا باپ ہونا بھی ثابت نہیں ہوسکتا۔ یہ خرابی ہے عقل کے اتباع میں۔ اسی لیے کہتے ہیں۔

آزمودم عقل دوراندیش را بعد ازیں دیوانہ سازم خویش را(۵)

(۱) ''برسوں تم دلخراش پتھر بنے رہو آزمائش کے طور پر کچھ زمانے خاک بن کر بھی دیکھ لو'' (۲) ''بہار کے موسم میں بھی پتھر سرسبز ہوتے خاک بنو تاکہ رنگ رنگ کے پھول اگیں'' (۳) ذوق خراب ہوگیا (۴) قرآن حالت پر ہنسنے لگے تو اس کے جواب میں فرماتے ہیں۔ وحدیث کے علوم کے پیچھے لگا ہوا ہے (۵) ''میں نے عقل دوراندیش کو آزمالیا جب اس سے کام نہ چلا تو اپنے آپ کو دیوانہ بنالیا''

دیوانگی سے مراد اطاعت کاملہ ہے جس میں بلا چون و چرا اتباع ہو اگر کوئی اس حالت پر ہنسے تو اس کے جواب میں فرماتے ہیں:

ما اگر قلاش وگر دیوانہ ایم مست آں ساقی وآں پیمانہ ایم(۱)

یعنی جو کوئی ہنسے اس سے کہہ دو کہ دیوانگی ہی تمہاری عقل سے اچھی ہے ہمارے نزدیک تو جو ایسا دیوانہ نہیں ہوا وہی دیوانہ ہے۔

اوست دیوانہ کہ دیوانہ نہ شد مرعسس را دید در خانہ نہ شد

جو دیوانہ نہیں وہی دیوانہ ہے جو شخص کوتوال کو دیکھتا ہے گھر میں چلا جاتا ہے، جب محبوب حقیقی کا عشق غالب ہوتا ہے عقل رفو چکر ہو جاتی ہے۔

تو یہ کیسا بھدا مذاق ہے(۲) کہ ہر بات کو عقل ہی سے معلوم کرنا چاہتے ہو۔ پھر اس کا نتیجہ وہی ہوگا جو اس جنٹلمین میں ظاہر ہوا کہ باپ سے بھی دلیل عقلی مانگتا تھا اس کے باپ ہونے پر اور جب یہ لوگ خدا ورسول کے ساتھ بھی عقل سے معارضہ کرتے ہیں تو باپ کے ساتھ کریں تو کیا تعجب ہے مگر افسوس یہ ہے کہ باپ کے ساتھ ایسا معارضہ کیا جائے تو باپ کو بھی ناگوار ہوتا ہے اور وہ ایسے بیٹے کو نالائق سمجھ کر عاق کر دیتا ہے اور دنیا بھی اس کو برا بھلا کہتی ہے مگر احکام خدا ورسول کے ساتھ کوئی یہ برتاؤ کرے تو نہ باپ اسے کچھ کہتا ہے نہ دنیا والے کچھ کہتے ہیں۔ صاحبو! کچھ تو انصاف کرو کہ جس عقل کا معارضہ آپ کو اپنے ساتھ بھی گوارا نہیں وہ معارضہ خدا ورسول کے ساتھ کیوں کر گوارا کیا جاتا ہے۔ میں اسی کی شکایت کر رہا تھا کہ بعض لوگوں نے اتباع عقل سے عقائد میں اتنا اختصار کر لیا ہے کہ وہ لا الہ الا اللّٰہ محمد رسول اللّٰہ کے اعتقاد ہی کو ایمان کے لیے کافی سمجھتے ہیں۔ بقیہ معادیات(۳) کی تصدیق کو ایمان کے لیے ضروری نہیں سمجھتے اور بعض نے یہ غضب کیا کہ محمد رسول اللّٰہ کو بھی اڑا دیا۔ کیونکہ حدیث میں تو اتنا ہی آیا ہے من قال لا الہ الا اللّٰہ دخل الجنۃ اس میں محمد رسول اللّٰہ کی قید کہاں ہے۔ چنانچہ انہوں نے کہہ دیا کہ جو شخص موحد ہو خواہ کسی مذہب کا ہو اور گو رسالت محمدیہ کا منکر ہو وہ جنتی اور ناجی ہے میں اس وقت ان لوگوں کا نام نہیں لینا چاہتا مگر ان کے استدلال پر مجھے ایک حکایت یاد آ گئی۔

(۱) ''ہم اگر قلاش اور دیوانہ ہیں تو کیا پرواہ ہے یہی کیا کم دولت ہے کہ ہم محبوب حقیقی کے متوالے اور اس کی محبت والے ہیں'' (۲) کتنا برا ذوق ہے (۳) آخرت کے معاملات

رامپور میں مجھ سے ایک طالب علم نے کسی ضرورت کے لیے وظیفہ پوچھا میں نے کہہ دیا کہ لاحول کثرت سے پڑھا کرو۔ کچھ دنوں کے بعد وہ پھر ملے اور کہنے لگے کہ میں وظیفہ پڑھتا ہوں مگر نفع نہیں ہوا۔ میں نے ویسے ہی اتفاقاً پوچھ لیا کہ تم نے کیا پڑھا تھا تو آپ کہتے ہیں کہ اسی طرح لاحول لاحول لاحول۔ میں نے کہا کہ تمہارے اس لاحول پر بھی لاحول۔ تو اگر اس طالب علم کا یہ سمجھنا صحیح تھا تو ان لوگوں کی دلیل بھی صحیح ہوسکتی ہے مگر کون نہیں جانتا کہ لاحول ایک پوری دعا کا پتہ ہے یعنی لا حول ولا قوۃ الا باللہ العلی العظیم کا۔ جیسے بسم اللہ ایک پوری آیت کا پتہ ہے اور الحمد پوری سورت کا۔ اسی طرح قل ھو اللّٰہ احد۔ اور یٰس پوری پوری سورت کا پتہ ہے (اور الٓمٓ ایک پورے سپارہ کا پتہ ہے۔ پس اگر ہم کسی سے یہ کہیں کہ نماز میں الحمد پڑھنا واجب ہے اور یٰسین کا ثواب قرآن کے برابر ہے اور وہ اس کا یہ مطلب سمجھے کہ صرف لفظ الحمد نماز میں واجب ہے اور اتنا ہی کافی ہے اور محض یٰس یٰس کہنے کا ثواب دس قرآن کے برابر ہے تو بتلایئے وہ احمق ہے یا نہیں۔ اور کیا ہر شخص یہ نہ کہے گا کہ بے وقوف یہ لفظ تو پتہ کے طور پر تھا اور اس سے مراد پوری سورت ہے اسی طرح حدیث میں لا الٰہ الا اللہ پورے کلمہ کا پتہ ہے اور مطلب حدیث کا یہ ہے کہ جو شخص مسلمان ہوجائے وہ جنتی ہے۔

اعتقاد رسالت کی ضرورت

اب یہ شریعت کے دوسرے مقامات سے پوچھو کہ مسلمان ہونا کسے کہتے ہیں۔ تو معلوم ہوگا کہ اس کے لیے رسالت محمدیہ کا اعتقاد بھی شرط ہے اور جنت و دوزخ کا بھی اور ملائکہ کے وجود کا بھی اور تقدیر کے حق ہونے کا بھی اور صراط و وزن وحساب و کتاب کا قائل ہونا بھی اور فرضیت صلوٰۃ وزکوٰۃ وصوم وحج کا اقرار بھی الخ۔ مگر ان عقلمندوں نے اس طالب علم کی طرح صرف لا الٰہ الا اللہ کو کافی سمجھ لیا۔ بلند شہر میں بھی ایک بڑے عہدہ دار اس خیال کے تھے کہ وہ بھی صرف توحید کے قائل ہونے کو نجات کے واسطے کافی سمجھتے تھے۔ میں نے سن کے ایک تقریر میں کہا کہ جو رسالت کا قائل نہیں وہ توحید کا بھی قائل نہیں بدون اقرار رسالت کے توحید کا تحقق ہی نہیں ہوسکتا۔ کیونکہ توحید کے یہ معنی تو نہیں کہ خدا تعالیٰ کو صرف ایک مان لے چاہے اس کے ساتھ عیوب سے ہی اس کو متصف

مانتا رہے۔ یقیناً اس کو توحید کوئی نہیں کہہ سکتا بلکہ توحید کے معنی یہ ہیں کہ حق تعالیٰ کو تمام عیوب سے منزہ اور تمام کمالات الوہیت کے ساتھ متصف مانے جن میں سے ایک کمال صدق بھی ہے جس سے خدا تعالیٰ کو متصف اور کذب سے منزہ ماننا(۱) لازم ہے اور جو شخص منکر رسالت ہے وہ حق تعالیٰ کو کاذب قرار دیتا ہے کیونکہ حق تعالیٰ تو محمد رسول اللہ فرماتے ہیں اور یہ اس میں حق تعالیٰ کو صادق نہیں مانتا تو ایک عیب سے خدا کو موصوف مانتا ہے اور یہ توحید نہیں۔ پس منکر رسالت موحد نہیں ہوسکتا (اور قرآن کے کلام الٰہی ہونے پر عقلی و نقلی دلائل ہر وقت قائم کر سکتے ہیں۔ پھر میں نے کہا کہ اس کے جواب کے لیے میں قائل کو دس برس کی مہلت دیتا ہوں۔ آخر وہ سمجھ گئے تھے اور اس عقیدہ سے توبہ کر لی تھی۔ اس کے بعد جو ملاقات ہوئی تو اس وقت وہ صحیح عقیدہ پر جمے ہوئے تھے اور اب وہ خیال نہ رہا تھا تو ان بعض نے تو عقائد میں سے محمد رسول اللہ کا اختصار کیا تھا جن کی غلطی معلوم ہوگئی۔ بعض نے عقائد میں اختصار نہیں کیا مگر وہ اعمال کا اختصار کرتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ نجات کے لیے مسلمان ہونا کافی ہے اور مسلمان توحید و رسالت کے اقرار سے ہوجاتا ہے پھر اور چیزوں کی کیا ضرورت ہے اور دلیل وہی کہ من قال لا الٰہ الا اللّٰہ ای مع محمد رسول اللّٰہ۔

اجزاء دین کی اہمیت

صاحبو یوں تو اس کا اصل جواب بہت عمیق ہے مگر میں اس وقت ایک موٹی سی بات عرض کرتا ہوں۔ وہ یہ کہ لا الٰہ الا اللّٰہ محمد رسول اللّٰہ کو کافی سمجھنا ایسا ہے جیسے ایک شخص نے نکاح کے وقت ایجاب وقبول کیا ہو اور جب بیوی اس سے نفقہ و کپڑا مانگے تو کہنے لگے کہ میں نے تو صرف تجھے قبول کیا تھا کھانا کپڑا کب قبول کیا تھا۔ یہ میرے ذمہ نہیں تو بتلایئے کیا اس کی بات قبول کی جائے گی؟ ہرگز نہیں بلکہ ہر شخص یہ کہے گا کہ بے وقوف بیوی کا قبول کرنا نکاح کے سب لوازم کو قبول کرنا ہے اور ساری برادری اس کو احمق بنائے گی۔ صاحبو اسی طرح لا الٰہ الا اللّٰہ محمد رسول اللّٰہ کہنا تو مذہب کو قبول کرنا ہے۔ یہ محض ایجاب وقبول ہے جس میں سارے لوازم مذہب کا قبول داخل ہے۔ حضرات! یہ سب کم فہمی کی باتیں ہیں جو آج کل کی جاتی ہیں بلکہ کم فہمی بھی نہیں یوں کہنا

(۱) اللہ کو صفت سچائی سے متصف اور صفت جھوٹ سے پاک ماننے۔

چاہئے کہ کم فہم بن گئے ورنہ کیا وجہ ہے کہ جو برتاؤ خدا اور رسول کے ساتھ کیا جاتا ہے وہی برتاؤ بیوی اور برادری کے ساتھ کیوں نہیں کیا جاتا۔ اگر آپ ایسے ہی محقق ہیں کہ بدون لم اور کیف (۱) کے کوئی بات مانتے ہی نہیں اور آپ کے نزدیک ہر چیز کا لازم ہونا صراحتاً قبول کرنے پر موقوف ہے تو پھر یہاں نکاح کے معاملہ میں لم اور کیف کیوں نہیں کیا جاتا اور نان نفقہ کو بدون قبول صریح کے کیوں لازم مان لیا جاتا ہے (۲)۔ بلکہ ہونا تو یوں چاہئے تھا کہ مخلوق کے ساتھ لم اور کیف ہوتا اور خدا کے ساتھ نہ ہوتا۔ مگر اب الٹا معاملہ ہے اور رسول کے احکام میں چون وچرا اور بیوی برادری کے معاملہ میں تسلیم ورضا۔ پس حدیث من قال لا الٰہ الا اللّٰہ دخل الجنۃ (حلیۃ الاولیاء لابی نعیم ۷/ ۱۷۴) سے عدم ضرورت اعمال پر استدلال کرنا محض غلط ہے۔ یہ تو وہ لوگ تھے جو عقائد میں اختصار کرتے اور اعمال کو غیر ضروری سمجھتے تھے۔ ایک جماعت ان کے علاوہ اور پیدا ہوئی، جنہوں نے عقائد میں تو اختصار نہیں کیا اور نہ اعمال کو غیر ضروری سمجھا مگر انہوں نے اعمال میں اختصار کیا۔ کچھ اعمال کو لے لیا اور بہت سے اعمال کو چھوڑ دیا۔ بس جو چیز آسان معلوم ہوئی وہ تو لے لی اور جس میں ذرا سی بھی دقت معلوم ہوئی اس کو اڑا دیا۔ اور اس میں طباع مختلف ہیں بعض کے عبادات بدنیہ آسان ہیں اور مالیہ مشکل ہیں۔ انہوں نے نماز اور روزہ تسبیح ونوافل کو اختیار کیا مقدس صورت بنالی۔ مگر وہ ایسے مقدس ہیں کہ نہ حج فرض ادا کرتے ہیں نہ زکوٰۃ دیتے ہیں، نہ معاملات میں احتیاط کرتے ہیں، ان کا لین دین نہایت خراب ہے۔ اور بعضے ایسے ہیں جن کو مال خرچ کرنا آسان ہے وہ حج بھی کرتے ہیں زکوٰۃ خیرات بھی دیتے ہیں مگر جان کا خرچ کرنا ان کو دشوار ہے اس لیے نماز اور روزہ سے جان چراتے ہیں اور بعض ایسے ہیں جو طاعات بدنیہ اور مالیہ دونوں کو بجالاتے ہیں مگر انہوں نے طاعات قلب کو چھوڑ رکھا ہے۔ ظاہر میں بڑے مقدس ہیں مگر دل میں تکبر وحسد، ریا وعجب بھرا ہوا ہے۔ محبت وخشیت الٰہی برائے نام ہے مگر اس کو وہ ضروری نہیں سمجھتے۔ بعض نے ان اخلاق کا بھی اہتمام کیا مگر ان کی معاشرت گندی ہے ذکر وشغل کرتے ہیں مگر اس کا اہتمام نہیں کہ ہمارے ہاتھ سے

(۱) بغیر کیوں اور کیسے کے (۲) بغیر واضح طور پر قبول کے کیوں مان لیا جاتا ہے۔

دوسروں کو ایذا نہ پہنچے۔ غرض ہر ایک کو جو بات آسان لگی وہ تو لے لی اور جس میں کچھ محنت کرنا پڑی اس کو چھوڑ دیا میں تو کہا کرتا ہوں کہ آج کل سائنس کی ترقی ہے۔ ہر چیز کا ست نکالا جاتا ہے تو ہمارے بھائیوں نے اعمال کا بھی ست نکال لیا، مگر صاحبو ست کا ست (۱) نہیں نکلا کرتا۔ دین تو سارا کا سارا خود ہی ست ہے۔ اس کا ہر جز وضروری ہے اب آپ دوبارہ اس کا ست نہیں نکال سکتے اور اگر نکالو گے تو ست نہ ہوگا، بلکہ اجزائے ضروریہ کو فوت کرنا ہوگا۔ جیسے کوئی شخص انسان کا ست نکالنا چاہے کہ اس کا ایک ہاتھ کاٹ دے اور ایک پیر اور ایک آنکھ پھوڑ دے اور ایک کان بند کردے تو کیا اس کو ست کہا جائے گا۔ ہرگز نہیں بلکہ یہ کہا جائے گا کہ اس نے ضروری اجزاء کو حذف کر کے ایک آدمی کو بے کار بنا دیا۔ یہی حال ہمارے بھائیوں نے دین کا بنا رکھا ہے۔ کسی نے یہ کیا کہ اعمال تو بہت ہی اچھے ہیں مگر عقائد میں کتاب وسنت کو چھوڑ کر رسوم بدعت کو داخل کرلیا اور اپنے کو دیندار سمجھتے ہیں۔ بعض نے عقائد کو سنت کے موافق رکھا ہے اور اعمال میں نہایت کوتاہی کی اور ان کو اپنے متبع سنت ہونے کا ناز ہے۔ غرض یہ مختلف فرقے ہمارے اندر پیدا ہوگئے۔ اور ساری خرابی کا منشا یہ ہے کہ لوگوں نے دین کے اجزاء کو پوری طرح نہیں سمجھا۔

اجزائے دین کی تفصیل

تو غور سے سن لیجئے کہ دین کے پانچ اجزا ہیں۔ ایک جز وتو ہے عقائد کا کہ دل سے اور زبان سے یہ اقرار کرنا کہ اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جس چیز کی جس طور پر خبر دی ہے وہی حق ہے (جس کی تفصیل کتب عقائد سے معلوم ہوگی) دوسرا جز وعبادات ہیں یعنی نماز روزہ زکوٰۃ وحج وغیرہ۔ تیسرا جز ومعاملات یعنی احکام نکاح وطلاق وحدود وکفارات وبیع وشراء واجارہ وزراعت وغیرہ اور ان کے جز ودین ہونے کا یہ مطلب نہیں کہ شریعت یہ سکھاتی ہے کہ کھیتی یوں بویا کرو اور تجارت فلاں چیز کی کیا کرو بلکہ ان میں شریعت یہ بتلاتی ہے کہ کسی پر ظلم وزیادتی نہ کرو اور اس طرح معاملہ نہ کرو جس میں نزاع (۲) کا اندیشہ ہو غرض جواز وعدم جواز بیان کیا جاتا ہے۔ چوتھا جز و ہے معاشرت یعنی اٹھنا بیٹھنا، ملنا، جلنا، مہمان بننا، کسی کے گھر پر جانا کیوں کر چاہئے اور اس کے کیا

(۱) جوہر کا جوہر یا عرق کا عرق نہیں نکالا کرتا (۲) لڑائی کا خدشہ

آداب ہیں۔ بیوی بچوں عزیزوں اجنبیوں اور نوکروں وغیرہ کے ساتھ کیوں کر برتاؤ کرنا چاہئے۔ پانچواں جزو جس کا نام ڈراؤنا ہے تصوف ہے اور ڈراؤنا اس لیے ہے کہ آج کل لوگوں نے یہ سمجھ لیا ہے کہ تصوف کے لیے بیوی بچوں کو چھوڑنا پڑتا ہے۔ تو خوب سمجھ لیجئے کہ یہ بالکل غلط ہے۔ یہ جاہل صوفیوں کا مسئلہ ہے جو تصوف کی حقیقت کو نہیں جانتے غرض یہ پانچواں جزو ہے جس کو شریعت میں اصلاح نفس کہتے ہیں۔ تو یہ پانچ اجزاء دین کے ہیں۔ ان پانچوں کے مجموعہ کا نام دین ہے اگر کسی میں ایک جزو بھی ان میں سے کم ہو تو وہ ناقص الدین ہے۔ جیسے کسی کا ایک ہاتھ نہ ہو تو وہ ناقص الخلقت (۱) ہے اب دیکھ لیجئے کہ ہم نے ان پانچوں کا کتنا اہتمام کر رکھا ہے حالت یہ ہے کہ بعض نے تو عقائد وعبادات کو کم کر رکھا ہے اور بعض میں معاملات کی کمی ہے اور معاملات کی تو یہ حالت ہے کہ بڑے بڑے اتقیاء (۲) معاملات کو دین ہی نہیں سمجھتے۔ چنانچہ برتاؤ سے یہ بات معلوم ہوجاتی ہے۔ وہ برتاؤ یہ ہے کہ نماز وروزہ کے مسائل تو مولویوں سے پوچھے جاتے ہیں مگر معاملات کو کوئی آکر نہیں پوچھتا۔ مثلاً کوئی گاؤں خریدیں یا کسی مورث (۳) کے مرنے کے بعد تقسیم جائیداد کا قصہ ہو تو اس میں آپ نے کہیں نہ دیکھا ہوگا کہ دستاویز علماء کو لاکر دکھائی جاتی ہو کہ دیکھئے اس میں کوئی بات خلاف شرع تو نہیں۔ اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ معاملات کو دین ہی نہیں سمجھتے حالانکہ معاملات کا دین میں داخل ہونا بالکل بدیہی ہے۔

قرآن شریف میں آیت مداینہ (۴) کو دیکھئے صرف قرض لینے کے کتنے احکام بیان فرماتے ہیں۔ چنانچہ ارشاد ہے کہ جب تم مدت معلومہ کے لیے ادھار قرض کا معاملہ کیا کرو تو اسے لکھ لیا کرو اور خود لکھنا نہ جانتے ہو تو کسی سے لکھوالیا کرو اور کاتب کے لیے حکم ہے۔ وَلَا يَأْبَ كَاتِبٌ اَنْ يَّكْتُبَ كَمَا عَلَّمَهُ اللّٰهُ فَلْيَكْتُبْ (۵) کہ لکھنے والا لکھنے سے انکار نہ کرے بلکہ لکھ دیا کرے۔ اگر لکھنے والا کوئی نہ ہو تو حکم کہ دو آدمیوں کو گواہ بنادو اور گواہوں کو ضرورت کے وقت گواہی دینا لازم ہے، کتمان (۶) سے گناہ ہوگا جس پر وعید مذکور ہے۔ اسی طرح اور بہت سے معاملات کے احکام قرآن میں موجود ہیں اور احادیث میں تو بہت ہی

(۱) اس کی تخلیق نامکمل ہے (۲) متقی لوگ (۳) کسی ایسے شخص کی موت کے بعد جس کے یہ وارث ہوتے ہوں (۴) قرض کے متعلق جو آیت ہے یعنی سورۃ البقرۃ کی آیت ۲۸۲ (۵) سورۃ البقرۃ: ۲۸۲ (۶) واقعہ کو چھپانے سے گناہگار ہوگا

زیادہ ہیں۔ پھر فقہ میں تو اتنی تفصیل ہے کہ کوئی قانون بھی اس سے زیادہ مفصل نہیں ہوسکتا۔

بری صحبت کا اثر

اس سے تو ان لوگوں کا جواب نکل آیا جو معاملات کو دین میں داخل تو سمجھتے ہیں مگر وہ علماء پر یہ الزام لگاتے ہیں کہ ان کو سوائے لایجوز (۱) کے کچھ نہیں آتا۔ کوئی دستاویز ان کو دکھلاؤ تو ناجائز۔ کسی ملازمت کو دریافت کرو تو ناجائز بس مولوی صاحب نے تو ایک لایجوز کا سبق پڑھ لیا ہے یہ تو ایک عام الزام ہے بعض نے اس سے بڑھ کر یہ کہا کہ مذہب ہی بڑا سخت ہے (پہلی جماعت تو علماء ہی کو الزام دیتی تھی انہوں نے خدا اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر بھی الزام لگا دیا) میں ان لوگوں کے اقوال کی کیا حکایت کروں ڈر بھی لگتا ہے اور غصہ بھی آتا ہے۔ لکھنؤ میں ایک کمیٹی ہوئی تھی جس میں سب مسلمان ہی جمع ہوئے تھے اور اس بات کی تحقیق کی جارہی تھی کہ مسلمانوں کے تنزل کا سبب کیا ہے۔ بالآخر یہ طے کیا گیا کہ تنزل کا اصل سبب اسلام ہی ہے۔ صاحب یہ وہ لوگ ہیں جن کا یہ دعویٰ ہے کہ ٹھیٹ اسلام ہمارا ہی اسلام ہے اور ہم ہی حامی اسلام ہیں۔ ان کی تجویز یہ ہے کہ مذہب اسلام ہی تنزل کا سبب ہے۔ (افسوس وہ اسلام جس کی بدولت حضرات صحابہ کو وہ ترقی حاصل ہوئی تھی کہ عالم میں اس کی نظیر نہیں مل سکتی۔ آج اس کو تنزل کا سبب کہا جاتا ہے۔ بخدا ان لوگوں نے اسلام کو سمجھا ہی نہیں عمل تو درکنار جن لوگوں نے اسلام کو سمجھا اور اس پر عمل کیا تھا ان کو تو کبھی تنزل نہ ہوا ہاں جو اس پر عمل ہی نہ کریں ان کو تنزل ہونے لگے تو اس کا کیا علاج مگر اس کا سبب اسلام یا ترک اسلام۔ ان لوگوں کی صحبت کا یہ اثر ہے کہ میں ایک دفعہ بریلی گیا تھا تو وہاں ایک بوڑھے میاں اپنے پوتے کو میرے پاس لائے کہ یہ نماز نہیں پڑھتا اسے کچھ نصیحت کردیجئے۔ میں نے اس سے پوچھا کہ بھائی تم نماز کیوں نہیں پڑھتے تو وہ کہنے لگا کہ مجھے تو خدا کے وجود ہی میں شک ہے نماز کس کی پڑھوں اور یہ کہہ کر اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے میں نے بوڑھے میاں سے کہا کہ تم کو نماز کی فکر ہے صاحب زادے کو تو ایمان بھی نصیب نہیں پہلے اس کی فکر کرو وہ مجھ ہی سے اس کی تدبیر پوچھنے لگے میں نے کہا کہ یہ کس جگہ تعلیم پاتا ہے معلوم ہوا کہ

(۱) ناجائز کہنے کے کچھ نہیں آتا۔

مسلمانوں کے ایک کالج میں پڑھتا ہے۔ میں نے کہا آپ اس کو بجائے کالج کے کسی گورنمنٹ اسکول میں داخل کرادیجئے۔ اس وقت تو ان کی سمجھ میں یہ علاج نہ آیا مگر انہوں نے اسی کے موافق عمل کیا۔ اگلے سال جو میں گیا تو معلوم ہوا کہ لڑکا بڑا پکا مسلمان ہے اور نماز بھی خوب پڑھتا ہے اس وقت لوگوں نے مجھ سے اس کی وجہ دریافت کی کہ کالج میں رہ کر اس کا اسلام کیوں کمزور ہوا اور گورنمنٹ کے سکول میں داخل ہوکر کیسے محفوظ ہوگیا حالانکہ اس کالج میں سب لڑکے مسلمان ہی ہیں وہاں تو اسلام کو قوت ہونا چاہئے تھی اور گورنمنٹ سکول میں ہندو مسلمان سب قسم کے ہوتے ہیں۔ میں نے کہا کہ کالج میں جتنے مسلمان ہیں سب آزاد ہیں اور وہاں رات دن ایسے ہی لوگوں کی صحبت ہے وہی مشغلہ ہے تو حالت بھی وہی ہوجاتی ہے جو سب کی ہے کیونکہ ان سے نفرت کی کوئی وجہ نہیں ہوتی ظاہر میں سب مسلمان ہوتے ہیں اس لیے ان کے خیالات اور صحبت کا اثر جلدی ہوتا ہے اور گورنمنٹ سکول میں چونکہ مسلمان لڑکوں کو ہندوؤں کے مذہب سے دلی نفرت ہے اس لیے ان کی صحبت کا مذہب پر برا اثر نہیں پڑتا اور نفرت کی وجہ سے چونکہ مقابلہ رہتا ہے اس لیے مقابلہ میں آکر یہ اپنے مذہب پر پہلے سے زیادہ مضبوط ہوجاتے ہیں اس سے معلوم ہوگا کہ مولوی انگریزی پڑھانے سے منع نہیں کرتے بلکہ عقائد کے بگاڑنے سے روکتے ہیں بعض لوگ اس کا جواب دیا کرتے ہیں کہ ہم تو انگریزی کے ساتھ اب دین کی تعلیم بھی دینے لگے ہیں تو اب تو اس سے منع نہ کرنا چاہئے۔ مگر صاحبو! محض دین کی تعلیم دینا کافی نہیں کیونکہ دین کی تعلیم دینے والے بھی تو وہی لوگ ہیں جن کے خیالات آزادی کی طرف مائل ہیں بلکہ تعلیم دین کے ساتھ صحبت نیک بھی ضرور تجویز کرنا چاہئے اگر اور بھی کچھ نہ ہو تو کم از کم تعطیلوں ہی میں ان لڑکوں کو کسی محقق کی صحبت میں بھیج دیا کیجئے۔

ہماری کوتاہیاں

میں یہ نہیں کہتا کہ آپ دین کے لیے اپنا قیمتی وقت صرف کریں کیونکہ اتنی ہمت کی آپ سے مجھے امید نہیں کیونکہ آج کل ہماری حالت یہ ہے کہ اللہ کے نام کے لیے خراب سے خراب چیزیں تجویز کی جاتی ہیں تو آپ اپنا اچھا وقت خدا کے لیے کیوں صرف کریں۔ اس پر مجھے ایک حکایت یاد آئی کہ ایک عورت نے کھیر پکا کر رکابی (۱) میں

(۱) پلیٹ

نکال کر رکھ دی اتفاق سے اس رکابی میں کتا منہ ڈال گیا تو اس نے مٹی کی دوسری رکابی میں اسے نکال کر اپنے لڑکے کو دی کہ مسجد کے ملا کو دے آ۔ وہ ملا جی کے پاس لایا تو بڑے خوش ہوئے اور فوراً ہاتھ مارنے لگے اور ادھر ہی منہ مارا جدھر سے کتے نے کھائی تھی لڑکے نے کہا کہ ادھر سے نہ کھاؤ ادھر سے کتے کی کھائی ہوئی ہے۔ یہ سن کے تو ملا جھلا گئے اور رکابی کو بہت دور پھینکا وہ پھوٹ گئی تو بچہ رونے لگا کہ ہائے میری ماں مارے گی ملا جی نے کہا کہ ابے مٹی ہی کی تو تھی، کہنے لگا اجی میری ماں میرے چھوٹے بھائی کو اس میں ہگایا کرتی تھی۔ یہ سن کر تو ملا جی کو متلی ہونے لگی (کہ ظرف و مظروف دونوں ہی نور بھرے تھے)۔

یہ حالت ہے ہم لوگوں کی۔ اللہ کے واسطے خراب سے خراب اور ناپاک چیزیں تجویز کرتے ہیں پھر غضب یہ کہ مسجد کے ملانوں کے ساتھ خود ہی تو یہ برتاؤ کرتے ہیں اور خود ہی ان کو ذلیل سمجھتے ہیں۔ ارے بھائی جب تم اپنے آپ اچھا سے اچھا کھاؤ اور ان کو کبھی نہ پوچھو اور جو پوچھو بھی تو ایسے وقت جب کہ تم خود نہ کھا سکو تو بتلاؤ وہ حریص ہوں گے یا نہیں۔ پھر تنخواہ ان کی ایسی قلیل مقرر کی جاتی ہے جس میں روکھی روٹی بھی وہ نہیں کھا سکتے۔ تو پھر حریص نہ ہوں تو اور کیا ہوں؟ اسی لیے میں تو کہا کرتا ہوں کہ جب محلہ میں کوئی رئیس بیمار ہوتا ہے تو مسجد کے مؤذن تو اس کی صحت کے لیے ہرگز دعا نہ کرتے ہوں گے وہ تو چاہتا ہوگا کہ اچھا ہے یہ مرے تو تیجے، دسویں، چالیسویں پر فاتحہ کا کھانا خوب فراغت سے ملے گا۔ کیونکہ خوشی میں ان کو کون پوچھتا ہے ایسے ہی مواقع میں پوچھا جاتا ہے تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ وہ ان مواقع کے منتظر رہیں گے۔ اس حرص کی نوبت یہاں تک پہنچ گئی ہے کہ کیرانہ میں ایک شخص کا انتقال ہوا تو کفن کا چادرہ لوگوں نے قبرستان کے تکیہ دار (۱) کو نہ دیا کسی دوسرے غریب کو دے دیا وہ تکیہ دار جھگڑنے لگا کہ یہ تو میرا حق ہے لوگوں نے کہا بھائی ہمیشہ تم کو دیا جاتا ہے آج اس غریب کو دیے دو تو وہ تکیہ دار کیا کہتا ہے کہ واہ حضور! خدا خدا کر کے تو یہ دن آتا ہے اسی میں آپ ہمارا حق دوسروں کو دے دیتے ہیں، لوگوں نے کہا کم بخت! کیا تُو اسی دن کا متمنی رہتا ہے کہ کوئی مرے تو تجھے کپڑا ملے جو یہ دن تیرے لیے خدا خدا کر کے آتا ہے وہ بات بنانے لگے مگر

(۱) قبرستان کا نگران

دل کی بات زبان پر آ ہی گئی۔ تو صاحبو! اس کی بھی کیا خطا جب تم اس وقت کے سوا کبھی اسے نہ پوچھو جب اس کی آمدنی یوں ہی ٹھہری تو وہ تو اسی کا وظیفہ پڑھے گا غرض چونکہ ہماری حالت یہ ہے کہ ہم خدا کی راہ میں نکمی ہی چیز دیا کرتے ہیں اس لیے میں وقت کے بارے میں بھی یہی کہتا ہوں یہ تعطیل کا نکما اور فالتو وقت خدا کی راہ میں نکال دو اور اگر سارا وقت نہیں دے سکتے ہو تو کم از کم آدھا ہی دے دو اور اس وقت میں بچوں کو محقق کی صحبت میں بھیج دیا کرو۔ کیونکہ دین ہوتا ہے بزرگوں کی نظر سے پیدا۔

محض کتابیں پڑھانے سے دین پیدا نہیں ہوتا بلکہ اس کے لیے صحبت صالحین کی بھی بہت ضرورت ہے پس میں انگریزی پڑھانے سے منع نہیں کرتا بلکہ یہ کہتا ہوں کہ تم علماء سے پوچھ کر اپنے لڑکوں کے دین سنبھالنے کا بھی کوئی انتظام کرو۔ چنانچہ میں نے اس لڑکے کی اصلاح کا طریقہ بتلایا اور بحمداللہ نفع ہوا اب تو لوگ علماء سے اس لیے نہیں دریافت کرتے کہ یوں سمجھ رکھا ہے کہ وہ سب سے پہلے انگریزی کو حرام بتلائیں گے حالانکہ ان کو دنیا سے کچھ ضد تھوڑا ہی ہے وہ تو یہ چاہتے ہیں کہ آپ دنیا کمائیں مگر دین برباد نہ ہو۔

جائز و ناجائز کی بحث

رہی یہ بات کہ مولویوں نے لایجوز ہی کا سبق پڑھا ہے اس کا جواب یہ ہے کہ جب آپ ساری باتیں چھانٹ چھانٹ کر ایسی ہی پوچھیں گے جو ناجائز ہوں تو ان کا جواب لایجوز کے سوا کیا ہوگا۔ صاحب اس کے بعد ان سے یہ بھی تو چھتے کہ تجارت وزراعت کے جائز طریقے کتنے ہیں اور ملازمتیں جائز کون کون سی ہیں۔ پھر دیکھیے وہ جائز کا کتنا وسیع دفتر آپ کے سامنے کھولتے ہیں۔ وسعت قانون کے معنی یہ نہیں ہیں کہ اس میں ممنوعات بالکل نہ ہوں ایسا تو کوئی بھی قانون نہ ہوگا اور اگر کوئی قانون اس شان کا ہو بھی تو وہ قانون کہلانے کا مستحق نہیں بلکہ وسعت قانون کے یہ معنی ہیں کہ اس میں ممنوعات کی فہرست کم ہو اور جائزات کی فہرست زیادہ ہو تو آپ قانون شرع کا بغور مطالعہ کریں تو معلوم ہوجائے گا کہ ہر باب کے اندر اس میں ممنوعات کم اور مباحات زیادہ ہیں لیکن اگر کوئی تمام صورتوں میں سے ممنوعات ہی کا انتخاب کر کے سوال کرنے لگے تو ظاہر ہے کہ سب کے جواب میں لایجوز ہی کہا جائے گا۔ پھر اگر بالفرض یہ مان لیا جائے کہ علماء نے

لا بجوز ہی کا سبق یاد کرلیا ہے تب بھی ان سے پوچھ لینے میں آپ کا نفع ہی ہے گو ان کے لا بجوز کہنے سے اس عمل کو ترک نہ کیا جائے وہ یہ کہ اگر آپ بدون پوچھے عمل ترک کرتے تو شاید حرام کو جائز سمجھ کر کرتے اور اب ناجائز سمجھ کر کریں گے۔ پہلی صورت میں گناہ کر کے اپنے کو گنہگار بھی نہ سمجھتے اور یہ حالت زیادہ خطرناک ہے اور دوسری صورت میں آپ اپنے کو گنہگار تو سمجھیں گے اور اس میں امید ہے کہ شاید کسی وقت توبہ کی توفیق ہوجاوے۔ یہ تو معاملات کی حالت تھی اور بعض نے اگر لین دین کے اس جزو کو بھی درست کرلیا تو اس نے معاشرت کو خراب کر رکھا ہے پھر بعض نے تو یہ کیا کہ گو تہذیب قدیم کو نہیں لیا مگر تہذیب جدید کو بھی نہیں لیا اور بعض نے تہذیب قدیم کو چھوڑ کر تہذیب جدید کو لے لیا میں کہتا ہوں کہ اس میں جواز و ناجواز کی بحث تو الگ رہی اس سے قطع نظر کر کے۔ ایک دوسری خرابی یہ ہے کہ یہ لوگ رات دن جس قومیت کا سبق رٹا کرتے ہیں کہ یہ ہر تقریر و تحریر میں ان کی زبان و قلم پر قوم قوم کا لفظ چڑھا ہوا ہے تہذیب جدید کے اختیار کرنے میں اس قومیت کا ابطال ہے تو عجیب بات ہے کہ زبان سے تو یہ اپنے کو حامی قوم اور ہمدرد قوم ثابت کرتے ہیں اور طرز عمل سے قومیت کی جڑیں اکھاڑتے ہیں کہ ان کی صورت سے اور بات سے کوئی اسلامی امتیاز ظاہر ہی نہیں ہوتا بلکہ اپنی قوم سے جدا معلوم ہوتے ہیں بس ان کی وہ حالت ہے۔

یکے بر سر شاخ و بن می برید خداوند بستان نگہ گرد دید(۱)

اسلامی تہذیب

علاوہ ازیں دوسری قوم کی معاشرت اختیار کرنا گویا اس بات کا اقرار ہے کہ (نعوذ باللہ) اسلام میں معاشرت نہیں ہے یا ہے تو عمدہ اور کافی نہیں ہے۔ ورنہ پھر یہ لوگ دوسری قوم کی معاشرت کیوں اختیار کرتے ہیں۔ واللہ اسلام میں تو معاشرت ایسی ہے کہ کہیں بھی اس کی نظیر نہیں مگر معاشرت اس کو نہیں کہتے کہ باجا بھی ہو اور تکلفات ہوں۔ (اور تکبر کا سامان بھی ہو کیونکہ تکبر اور تکلف تو معاشرت کی جڑیں اکھاڑتا ہے۔ اس لیے کہ متکبر دوسروں سے بڑا بن کر رہتا ہے پھر دوسروں کے ساتھ مساوات اور ہمدردی کہاں رہی۔ اسلام میں معاشرت کی تعلیم اس طرح دی گئی ہے جس سے انسان میں تواضع پیدا ہو اور تجربہ کرلیا جائے کہ بدون

(۱) ''ایک شخص شاخ کی جڑ میں بیٹھا ہوا شاخ کاٹ رہا تھا مالک باغ نے نگاہ ڈالی اور دیکھا''

تواضع کے ہمدردی اور اتفاق پیدا نہیں ہوسکتا اور یہی معاشرت کی جڑ ہے) پس اصل معاشرت اسلام ہی میں ہے۔ مثلاً کھانے پینے میں اسلامی معاشرت سنئے کہ رسول اللہ ﷺ نے زبان سے بھی فرمایا ہے اور کرکے بھی دکھلایا ہے۔ اء کل کما یاکل العبد کہ میں تو اس طرح کھاتا ہوں جیسے غلام کھایا کرتا ہے۔ آپ کی عادت تھی کہ جھک کر اکڑوں بیٹھ کر کھانا کھایا کرتے تھے۔ اب ہمارے بھائیوں کی نشست ملاحظہ ہو جو سراسر متکبرانہ ہے۔ اس کے بعد یہ دیکھئے کہ عقل کے قریب کون سا طریقہ ہے۔ اس کو ایک مثال میں سمجھئے، میں پوچھتا ہوں کہ اگر آپ جارج پنجم کے دربار میں جاویں اور وہاں آپ کو کوئی چیز کھانے کے لیے دی جائے اور حکم ہو کہ ہمارے سامنے کھاؤ تو بتلایئے۔ اس وقت آپ کس طرح کھائیں گے۔ کیا وہاں بھی آپ میز کے منتظر ہوں گے اور پالتی مار کر بیٹھیں گے یا غلاموں کی طرح جھک کر کھائیں گے۔ اور لیجئے کہ اس وقت جو چیزیں آپ کو دی جائیں اگر ان میں سے کوئی شے مرغوب نہ ہو تو انصاف سے کہئے کہ آپ اس کو بے رغبتی ظاہر کرکے کھائیں گے یقینا آپ رغبت ظاہر کرکے کھائیں گے۔ بے رغبتی ہرگز ظاہر نہ ہونے دیں گے۔ بس یہی اسلامی تہذیب ہے حضور ﷺ کی یہ حالت تھی کہ کان یاکل اکلا ذریعا کہ آپ رغبت ظاہر کرکے جلدی جلدی کھاتے تھے مگر لوگوں کی یہ حالت ہے کہ نہایت ہی ناز و انداز سے کھاتے ہیں۔ حضرت یہ ساری باتیں اس وقت تک ہیں جب تک حقیقت منکشف نہیں ہوئی اور اگر حقیقت کھل جائے اور معلوم ہو جائے کہ احکم الحاکمین کے دربار سے ہم کو یہ چیز کھانے کے لیے ملی ہے اور وہ ہم کو دیکھ رہے ہیں تو پھر خود بخود یہی طرز اختیار کرنا پڑے جو رسول اللہ ﷺ نے بتلایا ہے چنانچہ اسی مثال میں غور کر لیجئے کہ آپ جارج پنجم کے عطیہ کو اس کے سامنے بے رغبتی اور بے پروائی سے کھائیں گے یا نہایت رغبت سے۔ اور لیجئے حدیث میں ہے کہ اگر لقمہ گر پڑے تو اس کو صاف کرکے کھالو۔ اس کو بعض متکبر تہذیب کے خلاف سمجھتے ہیں مگر میں اسی مثال میں پوچھتا ہوں کہ اگر جارج پنجم کی دی ہوئی چیز میں سے کچھ گر پڑے تو آپ کیا کریں گے۔ کیا اس کو ویسے ہی چھوڑ دیں گے یا اٹھا کر سر پر دھریں گے۔ حضرت سارے مرحلے یہیں طے ہو جاتے ہیں جب کہ قلب میں کسی کی عظمت ہو۔ بس فرق یہ ہے کہ ہم لوگ یہ بات نہیں دیکھتے کہ اللہ تعالیٰ دیکھ رہے ہیں اور حضور ﷺ اس کو دیکھتے تھے اگر ہماری بھی

آنکھیں کھل جائیں تو وہی کرنے لگیں جو حضور نے کیا ہے اور جہاں جا کر یہ آنکھیں کھلتی ہیں اور کسی کی عظمت دل میں مستحضر ہوتی ہے وہاں اب بھی آپ کا یہی برتاؤ ہے۔ تو جب کہ اسلام میں معاشرت علی وجہ اتم موجود ہے تو پھر دوسروں سے کیوں لیتے ہو۔ غیرت یا حمیت (اور دعویٰ قومیت) کا مقتضا تو یہ تھا کہ اگر اسلامی معاشرت ناتمام بھی ہوتی جب بھی آپ دوسروں کی معاشرت اختیار نہ کرتے۔ چنانچہ کسی نے کہا ہے۔

کہن خرقہ خویش پیراستن به از جامہ عاریت خواستن(۱)

اپنا تو پرانا کمبل بھی دوسروں کی شال سے زیادہ عزیز ہوا کرتا ہے نہ یہ کہ اپنے پاس دوشالہ موجود ہے اور تم اس کو اتار کر دوسروں کا پھٹا ہوا کمبل اوڑھتے ہو۔ اسی طرح لباس میں بھی ہمارے بھائیوں نے دوسروں کی معاشرت اختیار کر لی ہے حالانکہ اسلامی معاشرت کے برابر لباس میں بھی کوئی معاشرت نہیں ہوسکتی۔ کھلی ہوئی بات ہے کہ اسلام میں لباس کے متعلق ماذونات (۲) کی فہرست بڑی اور ممنوعات کی چھوٹی ہے اور ہمارے بھائیوں کی معاشرت میں ماذونات کی فہرست تنگ اور ممنوعات کی بڑی ہے۔ حیرت کی بات ہے کہ آپ رات دن وسعت وسعت پکارتے ہیں اور علماء کو رائے دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ معاشرت میں تنگی نہ ہونا چاہئے اور طرز عمل یہ ہے کہ آپ نے ایسی معاشرت اختیار کر رکھی ہے جس میں سراسر تنگی ہے بھلا جس میں ماذونات کم اور ممنوعات زیادہ ہوں وہاں وسعت کہاں۔ آپ خود ہی تو ایک قاعدہ بناتے ہیں کہ وسعت ہونی چاہئے اور خود ہی اس کو توڑتے ہیں۔ یہاں سے معلوم ہوا ہوگا کہ درحقیقت آزادی شریعت ہی کی معاشرت میں ہے کیونکہ اس میں ماذونات زیادہ اور ممنوعات وقیود کم ہیں برخلاف جدید معاشرت کے کہ اس میں سراسر تنگی ہی تنگی ہے۔ یہ لوگ اس وقت تک کھا نہیں سکتے جب تک کرسی اور میز نہ ہو، اور ہم لوگ پلنگ پر کھالیں، بستر پر کھالیں، بوریئے پر کھالیں۔ بلکہ زمین پر بھی کھالیں ہمارے لئے کوئی قید نہیں، بتلایئے آزادی کی حالت میں کون ہے۔

جدید معاشرت

اب جدید معاشرت کو دیکھئے میں ایک مرتبہ اپنے بھائی کے یہاں کھانا کھا رہا تھا، تو

(۱) ''اپنی پرانی گدڑی پہننا مانگے ہوئے کپڑے سے بہتر ہے'' (۲) اجازت دی ہوئی چیزیں

ہم لوگ فرش پر بیٹھے ہوئے کھا رہے تھے اس وقت ایک جنٹلمین بھی مہمان تھے وہ کھانے کے لیے اس حلیہ سے آئے کہ کوٹ پتلون میں جکڑے ہوئے تھے۔ بیچارے آ کر کھڑے ہو گئے اور اس کے منتظر رہے کہ شاید میرے واسطے کرسی لائی جاوے گی مگر بھائی نے میری وجہ سے کرسی وغیرہ کا انتظام نہ کیا۔ دیر تک وہ کھڑے رہے مجھے شرم بھی آئی کہ ایسے کھڑے ہیں جیسے کوئی مانگنے آیا ہو، بالآخر وہ بہ تکلف اس طرح بیٹھے کہ دونوں پیر ایک طرف لمبے کر دیئے اور دھم سے گر پڑے اور کہنے لگے کہ معاف فرمایئے گا میں پیر لمبے کرنے پر مجبور ہوں۔ میں نے کہا کہ معاف فرمایئے گا میں کرسی پر کھانے سے معذور ہوں، ان کو پیر لمبے کرنے سے شرم آتی تھی اور مجھے کرسی پر کھانے سے شرم آتی تھی۔ میری شرم ایسی تھی جیسے علامہ تفتازانی کی شرم تھی اور ان کی شرم تیمور لنگ جیسی تھی۔ واقعہ یہ ہے کہ تیمور لنگ دربار میں پیر پھیلا کر بیٹھتا تھا کیونکہ اس کا ایک پیر بوجہ لنگ کے سیدھا رہتا تھا۔ علامہ تفتازانی اس کے زمانہ میں بہت بڑے عالم تھے۔ تیمور ان کی اتنی وقعت کرتا تھا کہ دربار میں ان کو اپنے پاس تخت پر بٹھلاتا تھا۔ جب پہلی مرتبہ علامہ تفتازانی دربار میں بلائے گئے اور تیمور نے ان کو تخت پر بٹھلایا تو یہ بھی تیمور کی طرح ایک پیر لمبا کر کے بیٹھے تیمور نے ناگواری سے کہا۔ معذورم دار کہ مرا لنگ است (یعنی مجھے معذور سمجھئے کیونکہ میرے پیر میں لنگ ہے) میں نے قصداً پیر لمبا نہیں کیا جس کا آپ نے مقابلہ کیا ہے۔ علامہ نے جواب دیا۔ ''معذورم دار کہ مرا ننگ است'' یعنی آپ بھی مجھے معذور سمجھئے کیونکہ مجھے ننگ وعار آتا ہے کہ ظاہر میں بادشاہ کی وضع سے کم تر وضع اختیار کروں۔ کیونکہ اس میں دیکھنے والوں کی نظر میں علم کی تحقیر ہے۔ تیمور خاموش ہو گیا۔ پھر ہمیشہ یہی دستور رہا کہ علامہ پاؤں پھیلا کر ہی تخت پر بیٹھتے تھے۔

اسی لیے میں نے بھی ان حضرت کے لیے کرسی نہ منگوائی کیونکہ اس میں اسلامی معاشرت کی توہین تھی، میں نے کہا اچھا ہے ذرا آج یہ اپنی معاشرت کا مزا تو چکھیں کہ اس میں کتنی مصیبت ہے۔ تو یہ کیا آزادی ہے کہ انسان بدوں کرسی اور میز کے بیٹھ ہی نہ سکے۔ ایک دفعہ میں کانپور کی مسجد میں حدیث شریف پڑھا رہا تھا کہ ایک انسپکٹر پولیس جو کہ جنٹلمین تھے اسی طرح کوٹ پتلون میں جکڑے ہوئے تشریف لائے اور لب فرش میرے منتظر کھڑے رہے کہ یہ اٹھ کر میرے پاس آئے اور میں باتیں کروں۔ مگر میں حدیث کو ان کے

لیے کیوں چھوڑتا بالآخر تھوڑی دیر کھڑے رہ کر چل دیئے۔ واللہ اس لباس سے زیادہ کیا جیل خانہ ہوگا جس میں کرسی کے آنے تک انسان کو مجرموں کی طرح کھڑا رہنا پڑے۔ تو میں اس وقت جائز و ناجائز سے بحث نہیں کرتا یہ تو دوسری بات ہے۔ ان سب سے قطع نظر کر کے کہتا ہوں کہ دوسری قوموں کی معاشرت اختیار کر کے وہ امتیاز قومی کہاں رہا جس کے یہ لوگ بڑے مدعی ہیں۔ اور اسلام کی وقعت کہاں رہی جس کے حامی اور خادم ہونے کا آپ کو دعویٰ ہے۔ اسلام کی یہی وقعت ہے کہ تم دوسروں کی معاشرت اختیار کر کے زبان حال سے اسلامی معاشرت کا ناکافی ہونا ظاہر کرو۔ نیز اس میں یہ خرابی الگ ہے کہ جس معاشرت کو آپ لے رہے ہیں اس میں تنگی اور قید بہت زیادہ ہے کہ ایک چیز دوسری لازم اور اس کو تیسری چیز لازم۔ ان قیود کی پابندی میں وہ آزادی کہاں رہی جس کا آپ سبق پڑھا کرتے ہیں۔ آج کل نوجوان آزادی کا سبق پڑھ کر شادی بیاہ کی رسموں کو منع کرنے لگے ہیں۔ مگر میں نے ایک موقع پر کہا تھا کہ یہ ہمارے لیے خوش کن بات نہیں کیونکہ ان رسموں کو اپنی رسموں کے پورا کرنے کے لیے منع کرتے ہیں خدا و رسول کی ممانعت کی وجہ سے منع نہیں کرتے۔ البتہ رسوم کو روکنا علماء کا حق ہے جنکا مذہب ہے۔ اور لیجئے سلام و کلام میں بھی ہمارے بھائیوں نے دوسروں کا طریقہ اختیار کر لیا ہے گویا شریعت کی معاشرت کو بالکل چھوڑ دیا (کوئی ٹوپی اتار کر سلام کرتا ہے، کوئی انگریزی لفظوں میں سلام کرتا ہے، کوئی آداب و تسلیمات کہتا ہے وغیرہ وغیرہ۔

مسئلہ استیذان

معاشرت کے بعض اجزاء کے متعلق تو بعض لوگوں کو یہ بھی خبر نہیں رہی کہ یہ شریعت کا حکم ہے بھی یا نہیں بلکہ اکثر لوگ اس کو اسلام سے خارج سمجھتے ہیں جیسے استیذان (۱) کا مسئلہ۔ اس کو بہت لوگ نئی بات سمجھتے ہیں اور اگر کوئی شخص یہ قانون مقرر کر دے کہ جب کوئی ملنے آئے تو پہلے اطلاع کر دے تو اس کو بدنام کرتے ہیں کہ اس نے انگریزوں کا طریقہ اختیار کر لیا حالانکہ استیذان کا مسئلہ اسلام ہی سے سب نے سیکھا ہے۔ چنانچہ یہ حکم قرآن میں موجود ہے، حدیث میں موجود ہے اور سلف کا طرز عمل بھی یہی تھا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے خود اس پر عمل کر کے دکھلایا ہے۔ البتہ اس کی حقیقت سمجھ لیجئے

(۱) ملاقات کے لیے اجازت طلب کرنے کا مسئلہ

کیونکہ جس طرح آج کل نوجوانوں نے طرز اختیار کیا ہے یہ انہوں نے حکم اسلامی کی اتباع کے لیے نہیں کیا بلکہ اس میں بھی وہ دوسری قوموں کا اتباع کرتے ہیں۔ تو سن لیجئے کہ اسلام میں استیذان کے لیے کارڈ بھیجنے کی ضرورت نہیں اور نہ ہر جگہ اور ہر مکان کے لیے اجازت مانگنے کی ضرورت ہے بلکہ قرائن سے یہ معلوم ہوجائے کہ کوئی شخص خلوت میں بیٹھا ہے، مثلاً بیٹھک کے کواڑ بند کر رکھے ہیں یا پردے چھوڑ رکھے ہیں یا زنانہ مکان ہے تو اس وقت استیذان (۱) کی ضرورت ہے اور اگر مردانہ مکان ہے اور کواڑ بند نہیں نہ پردے چھوڑے ہوئے تو بلا استیذان کے جانا جائز ہے (مگر یہ کہ قرائن سے معلوم ہوجائے کہ اس وقت کسی ضروری کام میں مشغول نہیں ہے۔ جس میں دوسروں کے آنے سے خلل واقع ہوگا) اور جہاں استیذان کی ضرورت ہے وہاں یہ طریقہ ہے کہ پہلے جا کر سلام کرو السلام علیکم! پھر اپنا نام بتلا کر کہو کہ میں اندر آسکتا ہوں؟ اگر وہ اجازت دے چلے جاؤ ورنہ تین دفعہ اس طرح کر کے لوٹ آؤ۔ چنانچہ حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ ایک مرتبہ حضرت عمرؓ کے پاس آئے اور تین دفعہ اسی طرح کر کے واپس ہوگئے۔ حضرت عمر فاروقؓ نے خادم سے فرمایا کہ میں نے ابوموسیٰ کی آواز سنی تھی ان کو بلالاؤ۔ اس نے باہر آکر دیکھا تو واپس ہوچکے تھے آکر عرض کیا تو فرمایا کہ جہاں ہوں وہیں سے بلالاؤ۔ جب وہ تشریف لائے تو پوچھا کہ آپ واپس کیوں ہوگئے تھے۔ فرمایا کہ ہم کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہی حکم فرمایا ہے کہ تین دفعہ سلام واستیذان کے بعد جواب نہ آئے تو واپس ہوجایا کرو۔ حضرت عمرؓ کو یہ مسئلہ معلوم نہ تھا۔ اس لیے فرمایا کہ تمہارے پاس کوئی گواہ ہے جو تمہارے موافق حضور کے ارشاد کو بیان کر سکے حضرت ابوموسیٰ گواہ کی تلاش میں مسجد نبی میں آئے جہاں انصار کا مجمع موجود تھا۔ انہوں نے کہا کہ ہم سب اس مسئلہ پر گواہ ہیں مگر تمہارے ساتھ ہم اپنے میں سب سے چھوٹے کو بھیجیں گے تاکہ حضرت عمر کو معلوم ہوجائے کہ انصار کے بچے بھی اس مسئلہ کو جانتے ہیں۔ چنانچہ ابوسعید خدریؓ اس مجمع میں سب سے چھوٹے تھے وہ گواہی کے لیے حاضر ہوئے اور آکر بیان کیا کہ واقعی حضور نے تین دفعہ کے بعد لوٹ جانے کا حکم دیا ہے۔ یہ تو حضور کا حکم ارشاد تھا۔ حضور

(۱) اجازت مانگنے۔

نے اپنے عمل سے بھی اس حکم کو ظاہر فرمایا ہے چنانچہ ایک بار حضور ﷺ حضرت سعد بن عبادہ کے گھر تشریف لے گئے اور تین مرتبہ فرمایا السلام علیکم ادخل حضرت سعد تینوں دفعہ اس خیال سے خاموش رہے کہ اچھا ہے حضور بار بار سلام فرمائیں تو ہم کو حضور کی دعا کی برکت زیادہ نصیب ہو۔ جب تیسری دفعہ کے بعد پھر آپ نے سلام نہ کیا تو وہ گھر سے نکل کر دوڑے اور دیکھا کہ حضور واپس تشریف لے جا رہے ہیں۔ جا کر حضور سے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! میں تو مزید برکت حاصل کرنے کے لیے خاموش ہو رہا تھا آپ واپس کیوں چلے؟ فرمایا کہ مجھ کو یہی حکم ہے کہ تین دفعہ سے زیادہ استیذان نہ کروں غرض پھر آپ واپس تشریف لے آئے۔ اگر آج کوئی ایسا قانون مقرر کر دے کہ اجازت لے کر آؤ اور تین دفعہ میں جواب نہ ملے تو واپس ہو جاؤ تو لوگ اس کو فرعون اور مغرور سمجھیں مگر حضور ﷺ کا اور حضرات سلف کا یہی طریقہ تھا اور تین دفعہ اجازت مانگنے پر اگر اجازت نہ ملے تو وہ بخوشی واپس ہو جاتے تھے گرانی مطلق نہ ہوتی تھی۔ تو دیکھئے یہ صورت کیسی آسان ہے اور اس میں کس قدر مصالح ہیں، پس ہماری معاشرت ہر طرح سے مکمل ہے کھانے پینے میں بھی اور ملنے ملانے میں بھی۔ مگر افسوس ہم لوگ اس کی قدر نہیں کرتے اور خواہ مخواہ دوسروں کے دروازوں پر دریوزہ (۱) گری کرتے ہیں۔

تصوف کی حقیقت

پانچواں جزو دین کا تصوف ہے۔ اس کو تو لوگوں نے بالکل چھوڑ رکھا ہے۔ اکثر لوگوں نے تصوف کے متعلق یہ سمجھ لیا ہے کہ یہ بہت ہی مشکل ہے کیونکہ اس میں بیوی بچوں کو چھوڑنا پڑتا ہے۔ یہ بالکل غلط ہے۔ صاحبو! تصوف کی حقیقت ہے خدا تعالیٰ سے تعلق بڑھانا۔ سو اس میں تعلقات ناجائز تو بے شک چھوڑنا پڑتے ہیں، باقی تعلقات جائزہ ضروریہ یہ تو پہلے سے بھی بڑھ جاتے ہیں۔ صوفیہ کے تعلقات اور معاملات بیوی بچوں کے ساتھ خوشگوار ہوتے ہیں کہ اہل تمدن کے بھی ویسے نہیں ہوتے۔ لوگ سمجھتے ہیں کہ یہ تصوف والے سنگ دل ہو جاتے ہیں حالانکہ وہ ایسے رحم دل ہوتے ہیں کہ انسان تو انسان جانوروں پر تک رحم کرتے ہیں۔ چنانچہ ان حضرات کے پاس رہ کر معلوم ہو سکتا

(۱) بھیک مانگتے پھرتے ہیں

ہے کہ وہ ہر شخص کی راحت کا کس قدر خیال کرتے ہیں لہٰذا اس سے متوحش ہونا نادانی ہے(۱) جس کی وجہ سے اسلام کا ایک ضروری جزو لوگوں سے فوت ہو رہا ہے۔ یہ جزو ایسا ضروری ہے کہ قرآن شریف میں اس کی تحصیل کا جا بجا امر ہے حق تعالیٰ فرماتے ہیں۔ یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقٰتِهٖ (۲) اس میں تکمیل تقویٰ کا امر ہے۔ یہی تصوف کا حاصل ہے اور مشاہدہ ہے کہ ایسا ڈرنا سوائے صوفیہ کرام اہل اللہ کے کسی کو بھی نصیب نہیں ہے۔ ان کی بات بات میں خشیت ہوتی ہے بیبا کی اور آزادی کہیں نام کو بھی نہیں ہوتی۔ اب حدیث میں اس کی تاکید کیجئے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں۔ ان فی جسد ابن اٰدم مضغة اذا صلحت صلح الجسد کله واذا فسدت فسدالجسد کله الاوهی القلب (۳) اس میں اصلاح قلب کی کتنی تاکید ہے کہ اسی کو مدار اصلاح قرار دیا گیا ہے اور یہی تصوف کا حاصل ہے اس میں بھی اصلاح قلب کا اہتمام ہوتا ہے۔

اسلام کی حقیقت

ایک اور حدیث میں ہے (جو حدیث جبریل کے نام سے مشہور ہے) کہ ایک دفعہ حضرت جبریل علیہ السلام بصورت انسان حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت مبارک میں حاضر ہوئے اور صحابہ کی تعلیم کے لیے انہوں نے حضور سے چند سوالات کئے جن میں پہلا سوال یہ تھا۔ یا محمد اخبرنی عن الاسلام قال الاسلام ان تشهد ان لا اله الا اللّٰه وان محمدا رسول اللّٰه وتقیم الصلوٰة وتؤتی الزکوٰة وتصوم رمضان وتحج البیت ان استطعت الیه سبیلا قال اخبرنی عن الایمان قال ان تومن باللّٰه وملٰئکته وکتبه ورسله والیوم الاخر والقدر خیره وشره (۴) اس سے معلوم ہوگیا کہ اسلام کے لیے

(۱) اس سے گھبرانا بے وقوفی ہے (۲) ''اے ایمان والو! حق تعالیٰ سے ڈرو جیسا کہ ڈرنے کا حق ہے'' سورۃ آل عمران: ۱۰۲ (۳) ''یعنی انسان کے بدن میں ایک ٹکڑا ہے جب وہ درست ہوجاتا ہے تمام بدن درست ہوجاتا ہے اور جب وہ بگڑتا ہے تو تمام بدن بگڑ جاتے ہے۔ سن لو وہ دل ہے (۴) ''اے حضور! مجھے بتلایئے کہ اسلام کی حقیقت کیا ہے؟، آپ نے فرمایا کہ اسلام یہ ہے کہ اللہ کے لاشریک لہ ہونے کی اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے رسول اللہ ہونے کی گواہی دو اور نماز کی پابندی کرو اور زکوٰۃ ادا کرو اور رمضان کے روزے رکھو اور بیت اللہ کا حج کرو اگر وہاں تک پہنچنے کی استطاعت ہو، حضرت جبرئیل نے پھر پوچھا کہ مجھے ایمان کی حقیقت بتلایئے۔ آپ نے فرمایا کہ ایمان یہ ہے کہ تم اللہ پر اور اسکے فرشتوں پر اور سب کتابوں پر اور سب رسولوں پر اور قیامت کے دن پر اور تقدیر پر ایمان لاؤ اور ان سب کی تصدیق کرو'' الصحیح لمسلم کتاب الایمان السنن ابی داؤد ۴۶۹۵

تصدیق رسالت و ایمان کے لیے قیامت اور تقدیر اور ملائکہ کی تصدیق بھی ضروری ہے اس کے بدون آدمی مومن نہیں ہوسکتا اور ظاہر ہے کہ قیامت کا ماننا اس کا نام نہیں کہ جس طرح جی چاہے مان لے بلکہ جس طرح حضور نے بتلایا ہے اس طرح مانے تو اس میں حساب و کتاب اور وزن اعمال اور پلصراط وغیرہ سب کا ماننا داخل ہے۔ اسی طرح یہ بھی معلوم ہوگیا کہ اسلام کا ایک جزو اعمال بھی ہیں۔ پس اس سے ان لوگوں کی غلطی واضح ہوگئی جنہوں نے اجزائے دین میں انتخاب کررکھا ہے۔ جیسا کہ اوپر مفصل ذکر ہو چکا ہے۔ قال فاخبرنی عن الاحسان قال ان تعبداللّٰہ کانك تراہ فان لم تکن تراہ فانه یراك (۱) (اور اس کا مقتضا بھی یہی ہے کہ جیسی عبادت خود ان کو دیکھ کر کرتے ہو ویسی ہی اب بھی کرو کیونکہ نوکر کو اگر یہ معلوم ہوجائے کہ حاکم مجھے دیکھ رہا ہے گو اسے نظر نہ آتا ہو جب بھی وہ ایسا ہی کام کرتا ہے جیسا کہ خود اسے آنکھوں سے دیکھ کر کرتا ہے) اس سے معلوم ہوا کہ اسلام و ایمان کی تکمیل کرنے والی ایک تیسری چیز اور ہے جس سے عبادت بدرجہ کمال ادا ہوتی ہے وہ احسان ہے اور اس کی تحصیل تصوف میں مطلوب ہے۔

اقسام اعمال

حقیقت اس کی یہ ہے کہ اعمال دو قسم کے ہوتے ہیں۔ ایک اعمال جوارح، دوسرے اعمال قلب، اعمال جوارح تو عبادات و معاملات و معاشرت وغیرہ ہیں اور اعمال قلب کی دو قسمیں ہیں ایک وہ جن کا معلوم کرنا اور یقین کرلینا کافی ہے ان کو عقائد کہتے ہیں۔ دوسرے وہ جن کو قلب کے اندر پیدا کرنا اور ان کے اضداد سے دل کو پاک کرنا ضروری ہے جیسے اخلاص و صبر و شکر محبت و خشیت و رضا و توکل و تواضع و قناعت وغیرہ۔ ان کا تو حاصل کرنا ضروری ہے اور ان کے اضداد کا دل سے نکالنا ضروری ہے۔ جیسے ریاء و کبر و غصہ طمع و حب دنیا وغیرہ۔ غرض کچھ کرنے کے کام اور کچھ نہ کرنے کے اور اسی سے اعمال جوارح عبادت وغیرہ درجہ کمال پر پہنچتے ہیں اور ان سب کی تکمیل کا نام احسان ہے۔ اب قرآن و حدیث سے دیکھئے کہ ان اعمال باطنہ کی تاکید ہے یا نہیں اور یہ معلوم

(۱) ''پھر حضرت جبرائیل نے پوچھا کہ بتلایئے احسان (واخلاص) کیا چیز ہے آپ نے فرمایا احسان یہ ہے کہ تم خدا تعالیٰ کی عبادت اس طرح کرو گویا اسے دیکھ رہے ہو کیونکہ اگر تم اسے نہیں دیکھتے تو وہ یقیناً تم کو دیکھ رہا ہے''

ہوتا ہے امر و نہی اور وعدہ وعید سے۔ سو قرآن میں ہے فَوَيْلٌ لِّلْمُصَلِّيْنَ الَّذِيْنَ هُمْ عَنْ صَلَاتِهِمْ سَاهُوْنَ الَّذِيْنَ هُمْ يُرَآءُوْنَ (۱) اس میں نماز میں ریا و غفلت پر سخت وعید ہے اور حدیث میں ہے۔ لا یدخل الجنة من کان فی قلبه مثقال ذرة من کبر (۲) یعنی جنت میں وہ شخص داخل نہیں ہوگا جس کے دل میں ذرہ برابر بھی تکبر ہو۔ اسی طرح قرآن وحدیث کو دیکھنے سے معلوم ہوگا کہ جا بجا اخلاق رذیلہ (۳) کی ممانعت اور ان پر وعید مذکور ہے اور اخلاق حمیدہ (۴) کی تاکید اور ان پر وعدہ موجود ہے، تو اس جزو اخلاق کا حاصل کرنا واجب ہوا اور یہی حقیقت ہے تصوف کی۔ پس تصوف کا جزو دین ہونا ثابت ہوگیا۔ مگر قاعدہ یہ ہے کہ ہر چیز کے کچھ توابع اور ذرائع ہوا کرتے ہیں جیسے حج کے لیے سفر کرنا اور زاد راہ ساتھ لینا جس سے وصولی میں سہولت ہو۔ اسی طرح تصوف میں اصل مقصود تو اصلاح قلب ہے کہ اخلاق حمیدہ حاصل ہوں اور رذیلہ زائل ہوں مگر اس مقصود کے لیے کچھ توابع وذرائع ہیں جن سے مقصود میں آسانی ہوجاتی ہے۔ جیسے اذکار واشغال واحوال وکیفیات (۵) جن کو آج کل لوگوں نے غلطی سے مقصود قرار دے لیا ہے مگر یہ محض توابع وذرائع ہیں (۶)۔ اصل مقصود اصلاح قلب ہے اور اس مقصود کا بھی ایک مقصود ہے یعنی رضائے حق جس کا ثمرہ قرب باری تعالیٰ۔ پس حاصل یہ ہوا کہ دین کی ترتیب اس طرح ہوئی کہ اول تو عقائد کو صحیح کرے پھر اعمال جوارح عبادات ومعاملات ومعاشرت کو درست کرے، پھر اصلاح قلب کا اہتمام کرے جس کا طریقہ کسی شیخ کامل سے پوچھے اور اس کے کہنے کے موافق ذکر وشغل میں لگے۔ اس سے اعمال قلب کی اصلاح آسانی سے ہوگی۔ کیونکہ ذکر وشغل سے حق تعالیٰ کے ساتھ تعلق بڑھ جاتا ہے تو قلب میں اخلاق حمیدہ کی قابلیت جلد پیدا ہوجاتی ہے اسی لیے ذکر کے ساتھ اخلاق کی طرف بھی توجہ رکھنا چاہئے (کیونکہ اصل چیز یہی ہے جس کی تحصیل ضروری اور فرض ہے رہا ذکر وشغل وہ تو امر مستحب ہے جو اس مقصود کا ذریعہ ہے)

(۱) ''سو ایسے نمازیوں کے لیے بڑی خرابی ہے جو اپنی نماز کو بھلا بیٹھتے ہیں جو ایسے ہیں جو ریاکاری کرتے ہیں اور زکوٰۃ بالکل نہیں دیتے'' سورۃ الماعون: ۴ تا ۶ (۲) اتحاف السادة المتقین للزبیدی: ۸۔۳۶۱
(۳) برے اخلاق (۴) اچھے اخلاق (۵) ذکر وشغل میں مشغول ہونا جس کی وجہ سے احوال وکیفیات کا طاری ہونا (۶) احوال وکیفیات توابع میں مقصود نہیں

یہ ہے امر مہم (۱) اور یہ ہے اصلی درس مگر بعض لوگ صرف ذکر واشغال پر اکتفا کرتے ہیں اخلاق کی درستی کا اہتمام نہیں کرتے۔ یہ حقیقت سے ناواقفی کی دلیل ہے اور اخلاق باطنیہ کی درستی اس طرح ہوتی ہے کہ شیخ کے سامنے اپنے امراض قلبیہ بیان کئے جائیں کہ ہمارے اندر فلاں فلاں امراض ہیں ریا یا عجب وکبر وغیرہ۔ پھر جو تدبیر شیخ بتلائے اس پر عمل کرے جیسا کہ امام غزالی نے ہر ہر مرض کی حقیقت اور ہر ایک کا جدا جدا علاج (احیائے العلوم میں) بیان فرمایا ہے۔ صحیح طریقہ تو یہ ہے تصوف کا۔ اور ایک وہ ہے جو آج کل لوگوں نے اپنی رائے سے سمجھ رکھا ہے۔ بس ذکر وشغل ہی پر کفایت کرنے لگے یاد رکھو اس طرح باطن کی اصلاح نہیں ہوتی۔ بلکہ صورت وہی ہے کہ امراض کا علاج بھی کرو۔ مثلاً ایک شخص میں تکبر ہے تو شیخ کو چاہئے کہ ذکر وشغل کے ساتھ اس کے سپرد ایسا کام بھی کرے جس سے نفس میں تواضع پیدا ہو۔ مثلاً نمازیوں کے لوٹے بھر کے رکھنا، ان کی جوتیاں سیدھی کرنا وغیرہ اور اگر شیخ نہ بتلاوے تو طالب کو خود ایسے کام کرنے چاہئیں۔ جن سے نفس میں تذلل (۲) پیدا ہو وعلی ہذا۔ اگر کسی میں حسد ہے تو اس کو چاہئے کہ محسود (۳) کی تعریفیں کیا کرے۔ اس سے قلب کا غبار نکل جائے گا۔ اس طرح ہر ہر مرض کا ایک خاص علاج ہے جو تصوف کی کتابوں سے معلوم ہوسکتا ہے۔ یہ ہے تہذیب اخلاق۔ اس کے بعد اس کا ثمرہ یعنی رضائے حق۔ مگر آج کل لوگوں نے ثمرہ اس کو سمجھ لیا ہے کہ کچھ لطائف جاری ہوجائیں کچھ گریہ رقت طاری ہونے لگے۔ صاحبو! یہ تو احوال ہیں جو غیر اختیاری ہیں۔ مطلوب وہ امور ہیں جو بندہ کے اختیار میں ہیں۔ یعنی اخلاق حمیدہ کا حاصل کرنا اور رزائل کا علاج کرنا اسی طرح کشف بھی مطلوب نہیں کشف ہوتا ہو اس کے لیے نعمت ہے شکر کرے بشرطیکہ غوائل کبر وعجب (۴) وغیرہ سے محفوظ ہو اور جس کو نہ ہوتا ہو اس کے درپے نہ ہو وہ سمجھ لے کہ میرے لئے کامیابی کا طریقہ یہی تجویز کیا گیا ہے کہ کشف نہ ہو کیونکہ بعض دفعہ کشف سے انسان بہت سی بلاؤں میں پھنس جاتا ہے۔ بس تم اپنے لیے کوئی طریقہ تجویز نہ کرو۔

بدردو صاف ترا حکم نیست دم درکش کہ آنچہ ساقی ماریخت عین الطاف است (۵)

(۱) یہ ہے اصل کام (۲) تواضع پیدا ہو (۳) جس سے حسد ہے اس کی تعریف کرے (۴) بشرطیکہ تکبر اور خود پسندی کے عیب سے محفوظ ہو (۵) ”تجھے صاف اور گندے سے مطلب نہیں تُو خاموش رہ جو کچھ ساقی نے ہمارے پیالہ میں ڈال دیا ہے وہ عین لطف ہے“۔

اور فرماتے ہیں:

تو بندگی چو گدایاں بشرط مزد مکن کہ خواجہ خود روش بندہ پروری داند(۱)

اور ساری وجہ پریشانی کی یہی ہوتی ہے کہ لوگ حالات و کیفیات کو مقصود سمجھتے ہیں۔ حالانکہ میں نے بتلادیا کہ یہ مقاصد میں سے نہیں محض توابع وذرائع ہیں۔ جو ہر ایک کو مختلف طور پر پیش آتے ہیں۔ بس یہ خلاصہ ہے دین کا کہ ان پانچوں اجزاء کو حاصل کیا جائے اسی کا بیان مختصر لفظوں میں اس آیت میں حق تعالیٰ نے فرمایا ہے: اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سَیَجْعَلُ لَهُمُ الرَّحْمٰنُ وُدًّا (۲) ان پانچوں اجزاء کی تحصیل پر آپ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ کے مصداق بنیں گے۔ پھر اس پر وہ ثمرہ مرتب ہوگا جو آیت میں مذکور ہے یعنی حق تعالیٰ کی محبوبیت حاصل ہوگی۔ جس کا تفصیل کے ساتھ پہلے ذکر ہو چکا ہے۔ آج تو تفصیل طریق کا بیان تھا سو بحمد اللہ اس وقت بقدر ضرورت طریق کی تفصیل بھی بیان کردی ہے اب عمل کرنا آپ کا کام ہے اب دعا کیجئے کہ حق تعالیٰ ہم کو فہم سلیم عطا فرمائے اور عمل کی ہمت دیں۔ آمین۔ (۳)

---

(۱) ''حافظ تو بندگی بشرط مزدوری فقیروں کی طرح مت کر اس لیے کہ آقا بندہ پروری کا طریقہ خود خوب جانتے ہیں'' (۲) ''بے شک جو لوگ ایمان لائیں اور عمل صالح کریں ہم ان کے لیے محبوبیت پیدا کردیں گے'' سورہ مریم: ۹۶ (۳) اللہ تعالیٰ تمام قارئین کو دین کے تمام اجزاء پر عمل پیرا ہونے کی توفیق عطا فرمائے آمین

خلیل احمد تھانوی
۲۸/محرم الحرام ۱۴۴۱ھ
۲۰۱۹/۹/۲۸ء

أخبار الجامعة

محمد منیب صدیقی

ادارۃ أشرف التحقیق۔ جامعہ دار العلوم الاسلامیۃ۔ لاھور

۱۔ گذشتہ ماہ جامعہ دارالعلوم الاسلامیہ میں محفل قراءت کا اہتمام کیا گیا جس میں مصر سے الشیخ عبد العزیز المنصور دامت برکاتہم نے شرکت فرما کر اس محفل کو رونق بخشی حضرت قاری احمد میاں تھانوی دامت برکاتہم کی ایماء پر اس محفل کی تکمیل کے بعد الشیخ المنصور نے نماز عشاء کی امامت کروائی اور قراءات سبعہ میں تلاوت فرما کر سامعین کے قلوب کو مسحور کیا۔ طلباء اور اہل علاقہ کی بڑی تعداد نے اس محفل میں شرکت کی۔

۲۔ جامعہ کے نائب رئیس وناظم ادارہ اشرف التحقیق مولانا ڈاکٹر خلیل احمد تھانوی دامت برکاتہم کی مرتب کردہ فن تواریخ اور علم الاعداد پر ایک منفرد کتاب بعنوان ''تواریخ اکابر'' بحمد اللہ تعالیٰ اپنی تکمیل کے آخری مراحل میں ہے۔ اس کتاب میں علم الاعداد سیکھنے سکھانے اور اہل ذوق کے لئے تواریخ نگاری کے فن کے مبادیات سے لیکر عملی طور پر تاریخ نکالنے تک تمام تر تفصیلات رقم کی گئی ہیں۔ جن اکابر علماء کرام کی تواریخ نکالی ہیں ان کے مختصر مگر جامع احوال بھی نقل کئے گئے ہیں۔ فن تاریخ گوئی کیا ہے؟ علم الاعداد کیا ہے؟ اس کے قواعد کیا ہیں؟ اس کی اقسام کتنی ہیں؟ اس کی اہمیت کیا ہے اور اس کے استعمالات کیا ہیں؟ جیسے تمام سوالات کے تشفی بخش جوابات رقم کئے گئے ہیں۔ بلاشبہ حضرت ڈاکٹر صاحب کو یہ کمال فن وراثت میں ملا ہے۔ گویا مفتی جمیل احمد تھانویؒ اور انکے برادر عزیز مولانا محمد احمد

تھانویؒ کی علمی وراثت کا عملی نمونہ منظر عام پر آ گیا ہے۔

۳۔ تفسیر احکام القرآن کی چھٹی جلد کی طباعت ثانیہ مکمل ہو کر جامعہ میں آ گئی ہے اہل ذوق جامعہ کی لائبریری سے حاصل کر سکتے ہیں۔اس طباعت میں بہت سے نمایاں پہلوؤں پر کام کیا گیا ہے جن کا اہتمام پہلی طباعت میں نہیں ہو سکا جیسے:

ا۔جدید طرز پر عالمی معیار کی کتابت دوبارہ کروائی گئی ہے جو جاذب نظر ہونے کے ساتھ ساتھ عبارت کے سمجھنے میں بھی نہایت مدد و معاون ہے۔

ب۔قواعد ترقیم و املاء کا خاص اہتمام کیا گیا ہے اور پیراگرافی کو باقاعدہ ماہرین کی آراء کی روشنی میں ازسرنو مرتب کیا گیا ہے۔

ج۔قرآنی آیات کو رسم عثمانی کے قواعد کے مطابق مع اعراب کے نقل کیا گیا ہے اور حوالہ جات کو جدید طرز پر سورۃ نمبر و آیت نمبر کے ساتھ لکھا گیا ہے۔

د۔احادیث کی مکمل تخریج کا اہتمام کیا گیا ہے جس میں حوالہ لکھتے وقت کتاب کے نام کے ساتھ باب کا عنوان اور مطبع بھی رقم کیا گیا ہے۔

۴۔ حضرت مولانا مشرف علی تھانویؒ کا اگلا وعظ (پچیسواں وعظ) تکمیل اسلام کا حصہ دوم مکمل ہو کر طباعت کے لئے جا چکا ہے جو ان شاء اللہ چند دن میں منظر عام پر آجائے گا۔